جلد ۱۳۳ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۸۴ء عدد ۲

مضامین

شذرات

، ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ ساؤتھ ایسٹ ایشین اسٹڈیز کے زیر اہتمام پاکستان کے نامور دانشور جناب سید حسام الدین راشدی پر ایک میموریل لکچر دینے میں خوشی محسوس کی،

جناب سید حسام الدین راشدی کی وفات اپریل ۱۹۸۲ء میں ہوئی، ان کی یاد میں کراچی یونیورسٹی میں میموریل لکچر کا ایک بورڈ قائم ہوا ہے اس کا پہلا لکچر ہارورڈ یونیورسٹی کی اینی میری شمیل نے دیا تھا دوسرے لکچر کے لئے راقم کو اس لئے دعوت دی گئی کہ مرحوم سے ۱۹۵۵ء سے بڑے گہرے تعلقات تھے، اس میموریل لکچر کے بورڈ کے صدر جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد فاؤنڈیشن) اور اس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ریاض الاسلام ہیں، جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں قائد اعظم محمد علی جناح چیر کے وزیٹنگ پروفیسر ہیں، یہ لکچر اردو لغت بورڈ کے نئے ہال میں ہوا، جو اس کی پہلی تقریب تھی مجمع بہت ہی منتخب تھا، یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ شہر کے اکابر اور ارباب علم کی بھی شرکت تھی، اس کی صدارت جناب حکیم محمد سعید نے کی، جناب جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے، ڈاکٹر ریاض الاسلام اردو لغت بورڈ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے ساتھ اہتمام میں ہر طرف سرگرم نظر آرہے تھے،

سید حسام الدین راشدی مرحوم نے حسب ذیل کتابیں اردو، سندھی اور فارسی میں ایڈٹ کیں، اور لکھیں (۱) مولانا محب اللہ سندھی، (۲) سندھی ادب (۳) مہران جون ماؤجون (۴) مثنوی جہانگیر نامہ از ادراکی بیگلار (۵) مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی، (۶) مثنوی مظہر الاعصار (۷) تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی (۸) قصائد و مثنویات از قانع ٹھٹھوی (۹) تذکرہ امیر خاں (۱۰) مثنویات ہشت بہشت از عطا ٹھٹھوی (۱۱) تاریخ مظہر شاہجہانی از یوسف میرک (۱۲) منشور الوصیت از میاں نور محمد (۱۳) تاریخ ترخان نامہ (۱۴) ہکلی نامہ (۱۵) تذکرہ حدیقۃ الاولیاء از عبد القادر ٹھٹھوی، (۱۶-۱۹)

تذکرہ شعرائے کشمیر جلد اول، دوم، سوم، چہارم (۲۰) تذکرہ روضۃ السلاطین از فخری ہروی (۲۱) تذکرہ جواہر العجائب از فخری ہروی (۲۲) دیوان فخری ہروی (۲۳) دود چراغ محفل (۲۴) میر محمد معصوم بھکری،

مقالہ میں ان کتابوں پر پورا تبصرہ کیا گیا تھا، یہ وہ کتابیں ہیں جن کی کیفیت اور کمیت سے متاثر ہو کر ناظرین ان کے مصنف کو پاکستان کے علم و فن کا شاہزادہ کہنے میں تامل نہ کریں گے، ان میں جو کتابیں ایڈٹ کی گئی ہیں ان میں جس جانکاہی اور جگر کاوی سے ان کے لئے مقدمے حواشی اور تعلیقات قلمبند کئے گئے ہیں وہ ان اہل قلم کے لئے ایک درس ہیں جو غیر معمولی محنت و ریاضت کرنے کے بجائے اپنے قلم کی گل کاری اور ظاہری صنعت گری دکھا کر مطمئن ہو جاتے ہیں، ان کتابوں میں سندھ اور خصوصاً ٹھٹھ کے گذشتہ علمی ادبی تاریخی اور اثری کارناموں کو روشن کرنے میں مصنف نے جو اپنا جذبہ دکھلایا ہے اس کو یاد کر کے لوگ برابر یہ کہہ اٹھیں گے،

ان کے گئے یہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا،

مقالہ پونے دو گھنٹے میں ختم ہوا، حاضرین بڑی خاموشی اور دلچسپی سے اس کو سنتے رہے جو مقالہ نگار کی محنت کا اصلی صلہ تھا، آخر میں جناب حکیم محمد سعید، جناب جمیل جالبی، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور ڈاکٹر ابو اللیث نے جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم کو اپنا اپنا خراج عقیدت پیش کیا، یہ مقالہ آئندہ ان میموریل لکچرز کے سلسلہ میں شائع کیا جائے گا،

ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ۱۴ر سے ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء تک انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں "مذاکرہ ملی تعلیمات نبوی، تصور ریاست اسلامی" کے عنوان سے بڑی صاف ستھری اور گرما گرم محفلیں ہوتی رہیں، ان میں مشغولیت کی تفصیلی روداد آئندہ معارف کی اشاعت میں آئے گی،

۲۹ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو حیدر آباد کے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے بھی جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم پر ایک دوسرا لکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا، حیدر آباد کا سفر کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے مشہور استاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ان کے بڑے بھائی اور رسالہ مہران کے اڈیٹر کی معیت میں ہوا،

وہاں سندھی ادبی بورڈ کے ڈائرکٹر جناب غلام ربانی اور جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم کے بھتیجے جناب حسین راشدی نے فیاضانہ اور مخلصانہ میزبانی کے فرائض انجام دیئے، جلسہ حیدرآباد کے نشنل سنٹر میں ہوا، جہاں شہر کے معززین اور ارباب ذوق کا بہت اچھا مجمع تھا، اس کی صدارت مہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اس۔ ام۔ قریشی نے کی، جو کچھ کراچی یونیورسٹی میں مقالہ کی صورت میں پیش کیا تھا، اس کو یہاں زبانی بیان کیا، بعض باتیں تالیوں کی گونج میں سنی گئیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پسند کی گئیں، آخر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر امجد بیگ، ڈاکٹر نجم الاسلام، میر امجد حسین جیلانی، ڈاکٹر غلام ربانی، اور ڈاکٹر اس ام قریشی نے جناب راشدی مرحوم کے علمی کمالات کی تعریف و تحسین کی،

~~~~~~~~

حیدرآباد کے قیام میں سندھ کی مہمان نوازی کے گوناگوں جلوے نظر آئے، سب ہی لوگ ملنے میں بچھے جاتے تھے، سندھ کے مشہور سابق رہنما جناب عبدالمجید سندھی مرحوم کے داماد ڈاکٹر شیخ محمد اسمٰعیل تو اخلاص و محبت کے پیکر بنے ہوئے تھے، وہ معارف کے بڑے قدردان ہیں، اس کو ہر طرح کی ریاضت گوارا کرکے برابر منگواتے رہتے ہیں، سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سنی احمد ہاشمی تو عزیزانہ طور پر ملے، انھوں نے علامہ شبلیؒ پر مقالہ لکھکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، پروفیسر غلام مصطفےٰ اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے در دولت پر بھی حاضری دی،

سندھی ادبی بورڈ کی علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا جس آب و تاب سے اس کی طرف سے سندھی میں کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ لائق تقلید اور قابل تعریف ہیں، سندھ یونیورسٹی کی سندھولوجی کا جو میوزیم ہے، وہ تو ہر سیاح کے لئے جاذب توجہ بنا ہوا ہے جس محنت اور خوش سلیقگی سے یہ آراستہ کیا گیا ہے وہ سندھ کی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے، واپسی میں ٹھٹھہ رک کر جناب راشدی مرحوم کے مزار پر فاتحہ پڑھی، جنھوں نے خود سندھ کے سابق رہنما جناب عبدالمجید سندھی مرحوم کے پہلو میں دفن ہونا پسند کیا تھا، راستہ میں جناب غلام ربانی صاحب برابر قسم قسم کی میزبانی کی اور سندھ کی دیرینہ روایت کے مطابق کراچی تک پہونچا کر واپس ہوئے،

افسوس ہے کہ ۲۶ جنوری کو ڈاکٹر سعید انصاری کا دہلی میں کینسر کے موذی مرض میں انتقال ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے قدیم رکن تھے انشاءاللہ آیندہ ان پر معارف میں مفصل لکھا جائیگا،

مقالات

سیرت نبوی ؐ کے متعلق مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح

مترجمہ ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

"الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" (رسول اللہ مستشرقین کی کتابوں کے آئینہ میں) کے بعض حصوں کا ترجمہ اس سے پہلے کے نمبروں میں کیا جا چکا ہے، اس حصہ میں مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرت کے واقعات کو مسخ کرنے اور انھیں توڑ مروڑ کر کیا سے کیا بنا دینے میں مستشرقین نے کس قدر تلبیس و تدلیس سے کام لیا ہے، ان سے ان کی فتنہ پردازی، بدنیتی اور تعصب کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، قرآن مجید نے مستشرقین کے پیش رو اہل کتاب کے متعلق جو یہ کہا تھا کہ

يَآهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (آل عمران ۱:۷)

اے اہل کتاب تم حق کو باطل میں کیوں گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو، درآنحالیکہ تم جانتے بھی ہو۔
~~~~~~~~

دوسری جگہ ہے :۔

وَاِنَّ مِنۡھُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ	اور ان اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں
اَلۡسِنَتَھُمۡ بِالۡکِتٰبِ وَمَا ھُوَ	کہ کتاب (توراۃ) کو زبان مروڑ
مِنَ الۡکِتٰبِ وَیَقُوۡلُوۡنَ ھُوَ	مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ
مِنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ وَمَا ھُوَ مِنۡ	پڑھتے ہیں کتاب میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب
عِنۡدِ اللّٰہِ وَیَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ	میں سے نہیں ہوتا اور کہتے ہیں کہ وہ
الۡکَذِبَ وَھُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ۔	خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے
(آل عمران ـ ۷۸)	نہیں ہوتا اور خدا پر جان بوجھ کر جھوٹ[۲۲]

تو وہ ان مستشرقین پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔" "مترجم"

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی مستشرقین کی غلطیوں کے بارہ میں رقمطراز ہیں ۔

"اسلام اور مسلمانوں کے واقف کار اور ماہر فرنگیوں کی تصنیفات عجیب وغریب اغلاط کا مجموعہ ہوتی ہیں جنھیں دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ان سے اور ان کی تحقیقات دونوں سے نفرت اور بدگمانی ہوتی ہے۔" (مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ۲۱ ـ ۳ ـ ۱۹۴۶ء)

محمد کرد علی نے مستشرقین کی غلطیوں کی متعدد قسمیں بتائی ہیں (۱) لفظی (۲) فکری یا حسی (۳) موضوع سے مصنف کی عدم واقفیت کے نتیجہ میں سرزد ہونے والی غلطیاں، اس قسم کی غلطیاں کرنے والوں کا دار ومدار غیر معتبر کتابوں پر ہوتا ہے، چنانچہ یہ لوگ سفرناموں، افسانوں، ناولوں اور مزاحیہ نگار صحافیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں، حالانکہ ان کتابوں کے مصنفین اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے نادر اور انوکھی باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور جب اس میں انھیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود اپنے ذہن وتخیل سے اس طرح کی باتوں کا اختراع کرتے ہیں اور انھیں

حقائق بنا کر پیش کرتے ہیں بعض غلطیاں جان بوجھکر قصد وارادہ سے کی جاتی ہیں، ان میں دینی عصبیت یا سیاسی غرض کارفرما ہوتی ہے، اور بعض دفعہ بیک وقت ان دونوں ہی باتوں کو دخل ہوتا ہے۔ (مجلۃ المجمع العربی دمشق ۲۱ ـ ۳ ـ ۱۹۴۶ء)

ان تہہ بتہہ اور زبردست غلطیوں کے اسباب وعوامل یہ ہیں۔ علوم ومعارف اسلامیہ کی وسعت، مستشرقین کا مبہم انداز بیان وجہالت نیز اسلام وپیغمبر اسلام کے خلاف ان کی سازش وریشہ دوانی۔

یہ کہنا کہ ہر بحث وتحقیق کرنے والے کی نگاہ سے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں اور اس سے سہواً کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ہوجاتی ہیں اور کبھی کبھی تو تحقیق کے مقدمہ وبنیاد ہی کے اندر ایسی خرابی اور غلطی راہ پاجاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں صحیح کے ساتھ غلط اور رطب کے ساتھ یابس شامل ہوجاتا ہے۔ پس اگر غلطیوں کے بارہ میں اس سے دوبارہ گفتگو کی جائے اور ان کی نشاندہی کردی جائے تو بحث ومباحثہ میں شدید اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے بلکہ وہ حق کی طرف رجوع کرے گا کیونکہ رجوع الی الحق ایک علمی فضیلت وبرتری ہے جو علماء وثقات کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، مگر مستشرقین عموماً دیدہ ودانستہ ایسی قبیح غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی غرض وغایت اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں پر واضح ہوجاتی ہے، اور وہ ان سے انھیں متنبہ کردیتے ہیں تو وہ کبھی تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور کبھی ان غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ خود مستشرقین کی غلطیوں سے واقف نہ ہوسکے تو ان کی غلطیاں تسلیم شدہ علمی حقائق ومسلمات بن جاتی ہیں جنھیں علمی وادبی بحث وگفتگو میں بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

عرب محققین میں رافعی، عقاد، کرد علی، جندی اور قطب وغیرہ نے مستشرقین کی بعض غلطیوں کو نمایاں کیا ہے اور خود بعض مستشرقین نے بھی اپنے ساتھیوں کی تاریخی، ادبی، لغوی، دینی اور علمی وفنی غلطیوں کی حقیقت ظاہر کردی ہے۔

بالقصد و بالارادہ کی جانے والی اکثر غلطیاں شکوک و شبہات اور طعن و تشنیع کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں خرافات کے علاوہ فتنہ و فساد انگیزی کا بھی دخل ہوتا ہے۔

ذیل میں مستشرقین کی غلطیوں کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی کے چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ اور آخر میں بعثت کے بعد کے واقعات زندگی کے بارہ میں ان کی بعض غلط بیانیوں کا ذکر کرکے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھیل کے بارہ میں غلط بیانی

ارونگ لکھتا ہے۔ "اس اثنا میں کہ محمدؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ کھیتوں میں کھیل رہے تھے ...... (سیرت پر مصنف کی کتاب ص ۳۴) اس کے بعد اس نے شق صدر (سینہ مبارک چاک کئے جانے کا واقعہ نقل کیا ہے، حالانکہ وہاں نہ کھیت تھے، اور نہ جھاڑیاں، جیسا کہ سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، سیرۃ ابن ہشام میں صرف اس قدر ہے کہ "حلیمہ کا بیان ہے کہ ہم انھیں (محمدؐ) کو لیکر جب اپنے گھر لوٹے تو چند ماہ بعد ایک روز وہ اپنے (رضاعی) بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے بھیڑ بکریوں کے گلے میں تھے کہ دفعتہً ان کا بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور مجھ سے اور اپنے باپ سے کہنے لگا کہ "ہمارے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑ کر ..... (سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۶۳)

اسی مفہوم کی روایت البدایہ والنہایہ میں بھی ہے۔

"حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد وہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بھیڑ کے ریوڑ میں ہمارے گھروں کے پیچھے تھے کہ ان کا بھائی دوڑتا ہوا آیا[۱] ... (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۶۴)

---

[۱] یہ روایت ابن اسحاق کی ہے، اور محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں "اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت ساتھ مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۴۹۰)

نوجوانی میں بھی اللہ کی جانب سے آپؐ کی مراسم شرک و جاہلیت سے حفاظت

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ۔ "محمدؐ کو دو بار خیال ہوا کہ شہر کے طرف میں پہنچ کر شہوت اور نوجوانی کے لطف و لذت سے متمتع ہوں مگر اچانک ایسی صورت پیش آگئی کہ وہ اس سے باز رہے۔" (ڈرمنگھم کی کتاب ص ۶۹)

صحیح یہ ہے کہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں، امام بیہقی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت علیؓ کی سند سے ہے "وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اہل جاہلیت عورتوں کے قصد و ارادہ سے جو کام کیا کرتے تھے، مجھے دو راتوں کے سوا کبھی اس قسم کا جاہلانہ خیال تک نہیں آیا مگر ان دونوں موقعوں پر بھی اللہ نے میری حفاظت کی، ایک رات میں مکہ کے بعض نوجوانوں کے ساتھ تھا، ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے، میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تم میری بکریاں دیکھتے رہنا تاکہ میں مکہ جاکر قصہ گویوں کی مجلس میں حصہ لوں، چنانچہ جب میں مکہ میں داخل ہوا، اور پہلے ہی گھر کے قریب پہنچا تو وہاں گانے بجانے کی آواز سنی، لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے، میں یہ منظر دیکھنے کے لیے بیٹھا مگر مجھے ایسی نیند آئی کہ سورج نکلنے کے بعد ہی آنکھ کھلی، دوسری شب میں بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا ہے[۱]" (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸۷)

---

[۱] یہ روایت نہایت ضعیف ہے علامہ ابن کثیرؒ نے اسے نقل تو کیا ہے مگر اس کے متعلق صراحت کر دی ہے کہ یہ نہایت غریب ہے اور اسکے بعض سلسلے حضرت علیؓ ہی پر جاکر ختم ہو گئے ہیں یعنی یہ روایت مسند کے بجائے موقوف ہے، صحیح واقعہ علامہ شبلیؒ کے بیان کے مطابق صرف اس قدر تھا کہ عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہو کر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا۔ لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کیلئے کھڑے ہو گئے، وہیں نیند آگئی۔ اٹھے تو صبح ہو چکی تھی، ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" (سیرۃ النبی ج اول ص ۱۸۵) ولیم میور نساء کا لفظ صرف اسی روایت میں ہے حالانکہ روایت میں بیان کئے گئے مضمون سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی مولانا شبلی نے سیرت کے حاشیہ میں سر ولیم میور کی لائف آف محمد صلعم سے یہ بھی لکھا ہے۔ "ہماری تمام تصنیفات محمد صلعم کے بارہ میں انکے چال چلن کی عصمت اور انکے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھی متفق ہیں" (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۸۶)

کامل ابن اثیر کے الفاظ اس سے مختلف ہیں، ملاحظہ ہوں۔

"جاہلیت کے زمانہ میں لوگ جو کام کرتے تھے میں نے بجز دو بار کے کبھی ان کا قصد و ارادہ نہیں کیا، مگر دونوں بار اللہ تعالےٰ میرے اور اس کام کے درمیان حائل ہو گیا اور پھر میں نے اس طرح کے کام کا کبھی ارادہ نہیں کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے اپنی نبوت سے سرفراز فرمایا۔" (الکامل جلد ۲ ص ۳۹)

طبری کے الفاظ بھی قریب قریب اسی طرح کے ہیں (تاریخ طبری ص ۱۱۲۶)

۳۔ عبادت نبویؐ ڈرمنگھم نے آپؐ کی عبادت کے متعلق بھی یہ غلط بیانی کی ہے کہ "آپؐ نے عزیٰ کے نام پر ایک سفید بکری کی قربانی کی تھی"۔ مگر سیرت ابن ہشام میں عبادت نبویؐ کے سلسلے میں اس طرح کی نجس و ناپاک حرکت کی مطلق نفی کی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ آپؐ جوان ہوگئے مگر جاہلیت کی خباثت اور ناپاکی کبھی آلودہ نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ کو آپ کرامت اور نبوت مقصود تھی اسلئے اس نے آپ کو جاہلیت کی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۹۵)

ابن کثیرؒ امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت زید بن حارثہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اساف و نائلہ کے نام سے تانبے کا ایک بت تھا، جسے طواف کرتے وقت مشرکین چھوا کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں بھی طواف کر رہا تھا، چنانچہ جب اس بت کے پاس سے گذرا تو اسے چھو دیا، آپ نے منع کیا لیکن میں نے اپنے جی میں کہا میں اسے ضرور چھوؤں گا، تاکہ دیکھوں کیا ہوتا ہے، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آئے۔" (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸۸)

غور کرو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت کے میلے ٹھیلے میں بھی نہیں جاتے تھے، اور نہ بتوں کو چھوتے تھے بلکہ انھیں چھونے سے منع کرتے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بت کے لیے سفید بکری کی قربانی کرتے ہیں۔

۱؎ ڈرمنگھم ص ۵۰۔ ۲؎ علامہ شبلی نے بھی اس روایت کو ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے، مگر انھوں نے سفید رنگ کے بجائے خاکی رنگ کی بھیڑ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں: "مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا۔ (بقیہ حاشیہ ص ۹۱)

۴۔ دکان، تجارت اور سفر کی کثرت ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ "ایک زمانہ میں مکہ کے اندر محمدؐ کی ایک دکان تھی"۔ یہ قطعاً غلط ہے، سیرت کے ماخذ سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ مزید براں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "محمدؐ جزیرہ عرب کے طول و عرض میں حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلوں کی سربراہی کرتے تھے"۔ (ڈرمنگھم ص ۹۱)

ارونگ کا بیان ہے۔ "حضرت خدیجہؓ سے شادی کے چند برس بعد سے آنحضرتؐ مستقل تجارت کرنے لگے تھے، اور قافلوں کے ساتھ دور دراز کا سفر بھی کرتے تھے"۔ (ص ۵۳)

(بقیہ حاشیہ ص ۹۰) بلکہ ولہوسن کا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھو مارگولس کی کتاب صفحہ ۷۰)، معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی کتاب) میں ایک روایت اس مضمون کی موجود ہے لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہو، ثانیاً یہ روایت کلبی سے ہے جو مشہور دروغگو ہے"۔ (حاشیہ سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۸۰) ۱؎ آگے رسول اللہؐ کے اسفار و مقامات سفر کے سلسلہ میں مصنف کے خیالات محتاج وضاحت ہیں اسلئے اسکے بارہ میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول سے جستہ جستہ بعض اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

"تجارت کی غرض سے شام و بصرے اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کیے تھے (ص ۱۴۲) آنحضرت صلعم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپؐ کا تشریف لیجانا ثابت ہے، ... حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپؐ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے ... نبوت کے بعد جس سال آپ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبد القیس کا وفد آیا تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لیکر وہاں کا حال پوچھا لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے"۔ (مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۲۰۶) مورخین یورپ جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے (مارگولس ص ۵)، مورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپ مصر بھی تشریف لیگئے تھے اور ڈیڈسی (بحر میت) کا بھی معائنہ کیا تھا لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے"۔ (سیرت جلد اول ص ۱۲۱) حاشیہ میں مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں، "یورپین مورخین جنکی بنیاد صرف قیاس و رائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن آنحضرتؐ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد مظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے، بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر بحرین تشریف لیجانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اسکا موقع عرب و شام کے درمیان ہے جہاں سے بار بار آپ کی

بوڈلے کا کہنا ہے کہ "محمد سولہ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے اتنے سفر کر ڈالے جتنے سفر مکہ کا کوئی باشندہ عمر بھر نہیں کرتا، مکہ سے یمن، شام فلسطین اور فارس کا سفر آپ کا معمول اور عادی امر بن گیا تھا، آپ کے زمانہ میں لوگ اس کثرت سے سفر صرف زیارت کعبہ کے لیے کرتے تھے۔"

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی لیکن آپ کی تجارت کی وہ شکل جو ان لوگوں نے بیان کی ہے، غیر معروف ہے، آپ یمن اور فارس تشریف نہیں لے گئے تھے، البتہ دمشق کے مضافات میں گئے تھے مگر دمشق میں داخل نہیں ہوئے، رہے رسول اللہؐ کے سفر تو ان کی تعداد چند ہی ہے۔ غالباً رسول اللہؐ کے مکہ سے سفر کے لئے نکلنے کی کثرت بیانی سے مستشرقین کا دو مقصد ہے: ایک تو یہ کہ آپ گذشتہ اور موجودہ مذاہب سے واقف تھے اور ان مذہبوں کے ماننے والوں سے آپ کے تعلقات تھے[۱]، دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ تجارت سے آپ کی فطری دلچسپی اور اس میں تجربہ، مہارت اور ہوشیاری کی بنا پر آپ اس لائق ہوئے کہ لوگوں کی سیاسی رہنمائی اور قیادت کر سکیں۔

۵۔ دوسروں سے تحصیل علم | بوڈلے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا کی صحبت میں رہکر عرصہ تک اس سے استفادہ کرتے رہے، یہ راہب جب اس کم سن عربی سے گفتگو کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے کسی رفیق سے گفتگو کر رہا ہے، چنانچہ اسی نے انھیں حضرت عیسیٰؑ کے عقیدہ اور بتوں کی پرستش کے حماقت ہونے پر

---

[۱] اس کے متعلق علامہ شبلیؒ کا یہ بیان گذشتہ حاشیہ میں گذر چکا ہے۔ "مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ تھے"۔ (سیرت جلد اول ص ۱۶۶) آگے بحیرا راہب کے مشہور واقعہ کے ضمن میں مزید تفصیل پیش کی جائے گی۔ (مترجم)

مطلع کیا تھا۔ اور محمدؐ اس کی باتوں کو نہایت غور و توجہ سے سنتے تھے[۱]۔

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ "گو محمدؐ کی مکتبی تعلیم کم ہوئی مگر انھوں نے حصول درس کے پیچھے جانے والے اور دن دن بھر حجرۂ درس میں بیٹھے رہنے والے طالب علموں سے بھی زیادہ حصول علم کیا تھا۔" (ص۴۹)

وہ اور دوسرے مصنفین یہ بھی کہتے ہیں کہ عکاظ کے میلہ اور قس بن ساعدہ کے خطبوں[۲] کے ذریعہ سے محمدؐ نے نصاریٰ اور ان کے فرقہ نسطوری کے اثرات بھی قبول کئے تھے۔ (ص۵۰)

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا کتاب مقدس دیکھنا یا اسے پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں ہے، گو یہ تسلیم ہے کہ اس کے اور بعض قرآنی قصوں میں مماثلت ہے، اور رسول اللہؐ نے جب

---

[۱] بحیرا کے مشہور واقعہ کا دارومدار جس روایت پر ہے، وہ سنداً ضعیف اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے، مولانا شبلیؒ نے اس پر مفصل نقد و جرح کی ہے ملاحظہ ہو (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۶۰ تا ۱۶۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں "تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مرگولیس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہؐ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے، انھی پر آنحضرتؐ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انھی نکتوں کی شرح اور حواشی ہیں۔ عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۶۷)

مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں "ڈریپر صاحب معرکہ علم و مذہب میں لکھتے ہیں، بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، آپکے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا... بعد میں آپکے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا، مسٹر ولیم میور جیسے مورخ بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب انھی سفروں اور اسکے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ممکن تھا توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اسکے سینہ میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۱۶۷)

[۲] قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ بہت مشہور ہے، گو ذہبی سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، مولانا شبلیؒ نے اسکے روات پر مفصل جرح کی ہے، اس سے قطع نظر نفس خطبہ کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر اسے ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا، فرماتے ہیں۔ (بقیہ حاشیہ ص ۹۵ پر)

بحیرا سے ملاقات کی تھی تو اس وقت آپ کی عمر نو برس تھی، اور یہ بالکل خلاف عقل و قیاس ہے کہ صرف ایک ملاقات نے آپ کے تمام اثرات محو اور زائل کر دیے ہوں، علاوہ ازیں اسلام کا عقیدۂ توحید جس کی آنحضرت صلعم نے دعوت دی اور انبیاءؑ کے جو خصوصیات اور جنت و دوزخ کے جو اوصاف

(بقیہ حاشیہ ص۹۳) "ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلعم خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اسکے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں اسلئے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ طرز انہی سے لیا ہے ..... ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا، کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دیدیتے تھے کہ انکے بارہ میں اشعار کہد دیں، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابو بکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابو طالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھدیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں ..... یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے کی پیشینگوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے مثلاً قس بن ساعدہ کا خطبہ ..... اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں انکے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں انکو دیکھکر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھکر یہ اشعار کہے ہیں ..... ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیوس نے بھی ایک موقع پر اسکی تصدیق کی ہے چنانچہ کہتے ہیں "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے" ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعرا سے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے۔ اور جب وہ زمانہ آئے گا۔ تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص۱۰۳)

بیان کئے اور شرائع و اخلاق کے سلسلہ میں جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ سب نجران کے نصاریٰ اور نسطوریوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہیں۔

یہ بات بھی نہایت عجیب و غریب ہے جس سے کتب سیرت کا تمام ذخیرہ خالی ہے کہ اس زمانہ میں مکہ کے اندر نہ رہے تھے، اور محمدؐ ان کے ایک فائق و برتر طالب علم تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کے واقعات کے سلسلہ میں مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۶۔ وحی کی ابتدا | ونسنک لکھتا ہے:۔ "حضرت جبریلؑ کے پہلی بار ظہور اور نبی پر غشی طاری ہونے کے بعد حضرت خدیجہؓ بہت خوف زدہ ہوئیں اور ایک گوشہ نشین راہب کے پاس آئیں، جس کا نام سرجیوس تھا، اس نے اطمینان دلایا اور بتایا کہ یہ جبریلؑ تھے، جو فرشتہ ہیں، اور تمام انبیاءؑ کے پاس بھیجے جاتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی اور بیہوشی طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ کپکپی طاری ہوئی تھی جو عموماً خوفزدہ لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے، اور حضرت خدیجہؓ تو وہ اس واقعہ سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسکین دے رہی تھیں کہ "بخدا اللہ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور راہ حق کی صعوبتوں اور شدتوں میں مدد کرتے ہیں"۔

احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ "یہ سمجھنا کہ حضرت خدیجہؓ کا واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا بالکل غلط اور صحیح و ثابت حدیثوں کے خلاف ہے، پھر وہ صحیح بخاری سے نزول وحی کی ابتدا سے متعلق حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں، کہ اس سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت خدیجہؓ اپنے ابن چچا زاد بھائی

ورقہ بن نوفل، کے پاس آپؐ کو لیکر گئی تھیں وہ عربی النسل تھے، کوئی عجمی النسل شخص مرجوہیں نہ تھے۔ (دائرۃ المعارف۔ ۹-۴، ۵)

۷۔ دعوت نبویؐ کا آغاز: ارفنج کہتا ہے:۔ "محمدؐ نے اپنے ارادہ سے بنی ہاشم اور قریش کے لوگوں کو مطلع کیا۔۔۔ انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کھلم کھلا اور جہراً کیا تھا۔" (ص ۶۲)

مگر ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں: "آپ نے اپنے راز سربستہ کا تذکرہ اپنے متعلقین میں ان لوگوں سے کیا جن کے بارہ میں مکمل اطمینان تھا، چنانچہ تمام لوگوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد آپ پر ایمان لائیں اور آپؐ کی تصدیق کی۔" (جلد دوم ص۵۰)

طبری کا بیان ہے: "اللہ نے نبوت سے سرفراز فرما کر آپ پر اور اپنے بندوں پر جو انعام کیا تھا، آپؐ اسے پوشیدہ طور پر اپنے انہی متعلقین سے ذکر کرتے جن کے بارہ میں اطمینان تھا، عمرو بن عنبسہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، ذوعکاظ میں تھے، عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کن لوگوں نے آپؐ کی دعوت قبول کی ہے؟ فرمایا دو آدمیوں نے جن میں ایک آزاد دوسرا غلام ہے، یعنی ابوبکرؓ اور بلالؓ نے، اس کے بعد میں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ طبری یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے والے اور آپؐ کی اتباع کرنے والے شخص آپؐ کے غلام زیدؓ بن حارثہ تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ اسلام لانے میں سبقت حضرت علیؓ نے کی تھی۔ (طبری جلد ۱ صفحات ۳۰۶، ۳۱۴ و ۳۱۶)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا آغاز پوشیدگی سے کیا تھا۔ اور ابتداً اپنے متعلقین اور ان دوستوں سے اس کا تذکرہ کیا تھا جو قابل اطمینان اور لائق اعتماد تھے، دعوت کا اعلان تو آپؐ نے تین[۱] برس بعد کیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ

اللہ نے نبی کو بعثت کے تین برس بعد حکم دیا کہ جو کچھ انھیں عطا کیا گیا ہے اسے کھلم کھلا اور علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔"[۱]

۸۔ حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کا غم: ارفنج لکھتے ہیں:۔

"محمدؐ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ اور اپنے چچا ابوطالب کی وفات کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا تھا، اور جس سال دونوں کی وفات ہوئی تھی اسے عام الحزن (غم کا سال) کہتے تھے۔" (ص ۹۶)

اس قدر صحیح ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے، سیر کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے لیکن ماتمی لباس پہننے کی بات درست نہیں ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں۔

---

[۱] تاریخ طبری جلد ۲ ص۳۱۸ و سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص۲۸۰ دراصل یہ تاریخ اسلام کا بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا، مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے، اس غلط بیانی سے مستشرقین کا یہی مقصد ہے، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں: "آنحضرت صلعم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں اگر آپ کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لیکر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیا کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پر خطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیضیاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدق دعوے کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے ۔۔۔ لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے ۔۔۔ تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا صاف حکم آیا۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۵)

"ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہجرت سے تین برس پہلے ہوئی تھی، ان دونوں کی وفات سے رسول اللہ صلعم کو بڑا صدمہ لاحق ہوا، آپ فرماتے تھے، کہ قریش کی جانب سے مجھے ناگوار اور تکلیف دہ حد تک مصیبتیں ابو طالب کی وفات کے بعد ہی پہنچیں"[1]

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

"خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات ایک ہی سال ہوئی، امام بیہقی فرماتے ہیں۔ ابو طالب کی وفات کے تین روز بعد حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا، ابن جوزی نے سند ثعلبہ بن صغیر اور حکیم بن حزام سے روایت کی ہے کہ پانچ دنوں کے فرق سے ابو طالب اور خدیجہ کی وفات ہوئی، اس طرح رسول اللہ صلعم دو مصیبتوں سے بیک وقت دوچار ہوئے، غم اس قدر شدید تھا کہ گھر میں پڑے رہتے تھے، اور باہر کم نکلتے تھے، اسکے بعد قریش کی ایذا رسانیاں بہت بڑھ گئیں"[2]

۹۔ رسول اکرم صلعم کا منبر | ڈر منگھم نے منبر نبوی کے متعلق اس طرح خامہ فرسائی کی ہے۔

"آپ وعظ کے وقت اپنے اسی منبر کے جو بیک وقت آپ کی کرسی، منبر اور تخت سب ہی تھا، ایک زینہ پر کھڑے ہوتے اور آپ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ یا سونے اور ہاتھی کے دانت سے جڑا ہوا عصا ہوتا جس سے نشانات اور لکیریں بناتے، منبر کے نیچے حضرت بلالؓ ایک سونتی ہوئی تلوار لئے کھڑے رہتے، اس کا قبضہ چاندی کا تھا، محمد صلعم نے یہ طریقہ آخر عمر میں عربوں کو متاثر کرنے کے لئے اختیار کیا تھا"[3]

حالانکہ کرسی اور تخت کبھی آپ کے استعمال میں نہیں رہے، آپ تو صحابہ کرام کے درمیان اس طرح مساویانہ بیٹھتے تھے، کہ نو وارد کو پتہ نہیں چلتا کہ آپ کون ہیں، اسی طرح سونا جڑا ہوا عصا

[1] الکامل ج ۲ ص ۹۰ و ۹۱ [2] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۲۰ [3] ایضاً ص ۱۲۴

اور چاندی کے قبضہ کی تلوار بھی آپ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی کیونکہ سونے اور چاندی کا استعمال اسلام میں حرام ہے، فاضل مستشرق نے منبر کی نسبت جو کچھ کہا ہے۔ اس کا کوئی ذکر کتب صحاح حدیث کی صحیح اور معتبر کتابوں، میں نہیں ملتا۔

۱۰۔ رسول اللہ کا پائجامہ پہننا۔ | دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] میں لفظ سروال کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے[2]

"رسول اللہ پائجامہ پہنتے تھے، متعدد حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ پائجامہ پہنتے ہیں؟ فرمایا ہاں سفر و حضر دونوں میں، مجھے ستر کا حکم دیا گیا ہے اور پائجامہ سے بڑھکر ستر پوش کوئی لباس نہیں"

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے، بلکہ سرتاپا بے اصل اور موضوع ہے، اس کے ایک راوی یوسف بن زیاد بصری منکر الحدیث ہیں جو خرافات و اباطیل بیان کرنے میں شہرت رکھتے تھے، اس روایت کے علاوہ دائرۃ المعارف میں اور بھی جتنی حدیثیں نقل کی گئی ہیں وہ سب کی سب مضوعی، موضوع اور سراسر بے اصل ہیں۔

۱۱۔ تکبیر و اقامت | جو نبیلؔ کہتے ہیں۔

"اقامت اذان ہی سے بنی ہے، اور اذان نصاری کے طریقۂ عبادت کی نقل ہے"

انھوں نے اپنی تائید کے لیے خطط مقریزی (جلد ۲ ص ۲۷۱) کا حوالہ بھی دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اذان اور اقامت دو چیزیں ہیں، دونوں کے الفاظ اور کلمات کی تعداد میں بھی فرق و اختلاف ہے اور اذان میں قطعاً کلیسا کے طرز عبادت کی کوئی نقل نہیں کی گئی ہے، کتب صحاح میں اذان کے بارہ میں جس حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے الفاظ محدود اور ترکیبیں معروف ہیں، محمد عوفہ نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے، آخر میں انھوں نے مقریزی کے حوالہ کی حقیقت یہ بتائی ہے،

[1] یہ مستشرقین کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا عربی ترجمہ ہے۔

خطط مقریزی کی جانب مراجعت کرنے پر معلوم ہوا کہ مقریزی کا اشارہ اس تسبیح کی طرف ہے، جو رات کو مناروں سے کہی جاتی ہے، اس بدعت کی ابتدا دور آخر میں مصر کے اندر ہوئی تھی سلف میں اس کا کوئی رواج نہ تھا۔ . . اس سے مستشرقین کو وہم ہوا کہ مقریزی نے اذان کی ابتدا کے مسئلہ پر بحث و گفتگو کی ہے، حالانکہ ان کی بحث کا تعلق اس تسبیح کی ابتدا سے ہے، جو مناروں سے رات میں کہی جاتی تھی۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ مع حاشیہ جلد ۱ ص ۴۵۶)

۱۲۔ عقیدہ | ماکڈونالڈ نے اللہ کے بارہ میں کریمر اور ہوتسمان کے حوالہ سے جو کچھ نقل کیا ہے، اس میں متعدد فحش اور قبیح غلطیاں ہیں۔

(الف) محمدؐ نے اللہ کو جن صفتوں سے متصف کیا ہے، وہ عام لوگوں کے لئے معیوب و مذموم خیال کی جاتی ہیں، جیسے جبار و متکبر۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ان صفتوں کے جو معنی ہیں وہ اللہ کی عظمت و جلال کے بالکل شایان شان ہیں چنانچہ جبار وہ ذات ہے جو اپنی مخلوق کو اپنے ارادہ پر آمادہ اور مجبور کرتی ہے۔ اور متکبر وہ ہستی ہے جو اپنے بندوں کے ظلم سے بلند و برتر ہے۔[1]

(ب) ان لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرتؐ نے اللہ کے لئے متضاد و متناقض صفتیں بیان کی ہیں،

---

[1] مصنف نے ان صفتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے، مفسرین نے اسے بھی لکھا ہے مگر درحقیقت جبار کے اصلی معنی تگڑے اور زور آور کے ہیں قرآن مجید میں اس زور آور قوم کیلئے بھی یہ لفظ آیا ہے جس سے ڈر کر بنی اسرائیل نے عمالقہ کی بستی میں جانے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا۔ (اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ) یعنی اس بستی میں بڑے زور آور اور تگڑے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ نہایت تگڑا اور زور آور ہے اس سے زیادہ تگڑے اور زور آور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اس سے ان مشرکین کی تردید مقصود ہے جو ہر زبردست اور زور آور کے سامنے اپنے کو جھکا لیتے ان کی پرستش کرنے لگتے، اور اسے دیوی دیوتا سمجھنے لگتے ہیں۔ اور متکبر کے معنی ہیں اپنی عظمت، برتری اور بڑائی کا احساس رکھنے والا یہ احساس اللہ کے سوا کسی کے اندر ہو تو یقیناً باطل ہے، اس لئے کہ کسی کی بڑائی اسکی ذاتی شی نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہے اللہ کیلئے یہ عظمت اور تکبر اسلئے مناسب ہے کہ اسکی بڑائی ذاتی، ازلی اور ابدی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی اسی کبریائی کی وجہ سے اپنی عبادت اور خدائی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ (مترجم)

ان لوگوں نے اس تناقض و تضاد کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے، غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی صفت عفو و غفور ہے، اور دوسری طرف منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، مگر دراصل یہ کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ صفتیں اپنے متعلق کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہو گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے غفور و عفو ہے جن سے عفو و مغفرت کی اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، اور منتقم اور شدید العقاب ان لوگوں کے لئے ہے جن کو سزا دینا اس کی حکمت و مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے، اس کی مثال بعینہٖ درج ذیل آیت ہے، جس میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی بظاہر متضاد صفتیں بیان ہوئی ہیں، حالانکہ وہ متضاد نہیں ہیں:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ... (فتح - ۲۹) (دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۲ ص ۵۶۴)

محمدؐ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں کفار پر سخت، آپس میں رحمدل ہیں۔

۱۳۔ اسلامی حدود | ڈرمنگم کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی پر جو منافقین کا سردار تھا، اس لیے حد جاری نہیں کی کہ وہ اپنی قوم اور اہل مدینہ میں غیر معمولی اثر و نفوذ رکھتا تھا۔ (حیات محمد از ڈرمنگم ص ۳۰۵)

صحیح یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو منافقین کا نام بنام علم تھا، مگر اس کے باوجود آپ نے کسی منافق کو کبھی کسی قسم کی سزا نہ دی، خواہ وہ لیڈر رہا ہو یا کوئی اور، اسکی وجہ یہ امید اور توقع تھی کہ شاید وہ صحیح طریقہ پر اسلام قبول کر لیں اور مسلمانوں کی صف اور جماعت میں شامل ہو جائیں، علاوہ ازیں آپؐ کو ان سے قتال کرنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا تھا، رہی یہ آیت:۔

یَآ اَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ (تحریم - ۹)

اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو۔

تو مفسرین کا خیال ہے کہ منافقین سے جہاد کا مطلب یہ ہے کہ انھیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اس سلسلہ میں جس قدر بھی ممکن ہو کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر رئیس المنافقین کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو غزوۂ بنی المصطلق[1] کے بعد خود ان کے صاحبزادے ہی انھیں رضا و رغبت سے قتل کر ڈالے ہوتے۔

۱۴۔ ہجرت ہجرت کے وقت آپ کے گھر سے نکلنے کے بارے میں ارفنج نے لکھا ہے۔

"واقعہ کے متعلق ایک محتمل روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے گھر کے پیچھے کی دیوار سے کود کر نکلے تھے، اور اترتے وقت ان کے خادم نے انھیں سہارا دیا تھا۔ اور آپ نے اسکی پشت سے سیڑھی کا کام لیا تھا۔" (ص ۱۱۸)

وہ آگے یہ بھی لکھتا ہے۔

"ابھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفیق حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک گھوڑوں پر سوار ایک جماعت ان کے پاس آگئی جس کی قیادت

---

[1] یہ غزوہ ۵ھ میں غزوۂ خندق سے کچھ پہلے ہوا تھا، یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، اسکی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس غزوہ میں غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی شریک تھے، جو ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اس کو موقع ہاتھ آیا، انصار سے مخاطب ہو کر کہا تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، اب بھی تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے جب آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو حضرت عمرؓ بھی موجود تھے بولے، ارشاد ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دی جائے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا کرنا پسند کرتے ہو کہ محمد اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں۔

عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ تھا، باپ جس درجہ کا منافق اور دشمن اسلام تھا، یہ اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے، آنحضرت صلعم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں، یہ سنکر وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں، لیکن اگر حکم ہو تو میں بھی اس کا سر کاٹ لاؤں، آپ نے اطمینان دلایا کہ قتل کے بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔

سراقہ بن مالک کر رہے تھے۔" (ص ۱۱۹)

حالانکہ سیرت کے عربی ماخذ میں اس روایت کا ذکر تک نہیں ہے، اس لئے یہ جھوٹی اور گڑھی ہوئی ہے، سراقہ کے واقعہ میں بھی غلط بیانی کی گئی ہے، صحیح و ثابت یہ ہے کہ وہ تعاقب میں تنہا اور پوشیدہ نکلے تھے۔[1]

۱۵۔ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہؓ ارفنج کا بیان ہے کہ آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت سودہؓ سے اپنی دوسری بیویوں کی طرح محبت نہیں کرتے تھے، اور چند برس بعد ہی آپ نے ان سے اہمال اختیار کر لیا تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت ایک قلبی معاملہ ہے جس کا ادراک دوسرے لوگ نہیں کر سکتے، دوسرے حضرت سودہؓ کی شادی کے واقعہ سے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت و محبت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے،

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ کی یہی اکیلی بیوی تھیں[2]، ان کے نکاح کا واقعہ ابن کثیر وغیرہ کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ خولہ بنت حکیم آنحضرتؐ کے ایما سے حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے کہا محمد شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کر و، خولہ نے کہا انھیں یہ پسند ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "جب سودہ بوڑھی ہو گئیں تو انھوں نے اپنی باری مجھے دیدی" ابن عباسؓ فرماتے ہیں، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی ایک عورت حضرت سودہؓ سے نکاح کیا جن کے پہلے شوہر سے پانچ یا چھ بچیاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا مجھ سے تمہیں کیا مانع ہے؟

---

[1] سراقہ کے واقعہ کی تفصیل استیعاب ابن عبدالبر وغیرہ میں موجود ہے ملاحظہ ہو آنحضرتؐ کے مکہ سے نکلنے کے بعد مشرکین نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد اور ابوبکر کو قتل کر دیگا یا انھیں زندہ پکڑ لائے گا اسکو گراں قدر انعام دیا جائے گا، سراقہ اپنے قبیلہ بنی مدلج کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ میں نے ابھی ساحل کی طرف سیاہی دیکھی ہو میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہیں سراقہ کو یقین ہو گیا لیکن انعام کی طمع میں انھوں نے تردید کی کہ نہیں وہ لوگ نہیں ہیں تم نے فلاں شخص کو دیکھا ہوگا جو ابھی ہمارے سامنے گیا ہے تھوڑی دیر بعد سراقہ اٹھ کر گھر گئے اور لونڈی کو کہا کہ وہ گھوڑا تیار کر کے انھیں ایک مقام پر دے اور نیزہ سنبھال کر چپکے سے گھر کی پشت سے نکلے لونڈی سے گھوڑا لیا اور لوگوں کی نظر بچا کر نکل گئے اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنحضرت صلعم کے پاس پہنچ گئے

[2] چونکہ حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ کا نکاح قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لئے مورخین کا اختلاف ہو کہ کس کو تقدم حاصل ہے ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے عبداللہ ابن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں تاہم اس قدر مسلم ہے کہ حضرت عائشہؓ نکاح کے بعد تقریباً ساڑھے تین برس تک میکہ ہی میں رہیں اس بنا پر اس عرصہ میں عملاً حضرت سودہؓ گویا آنحضرتؐ کی تنہا بیوی تھیں۔

عرض کی اے اللہ کے رسول! آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں، میں آپ کی نہایت تعظیم و تکریم کرتی ہوں، یہی میرے لئے مانع ہے کہ آپ کے سر پہ بچیاں صبح و شام سوار رہیں گی آپ نے فرمایا کوئی اور مانع تو نہیں ہے، عرض کی نہیں خدا کی قسم اور کوئی مانع نہیں، ارشاد ہوا اللہ کی تم پر رحمت ہو، قریش کی نیک بخت عورتیں اپنے چھوٹے بچوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہوتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کا کتنا لحاظ اور خیال رکھتی ہیں۔" (البدایۃ النہایہ جلد ۳ ص ۱۳۲ و ۱۳۳)

یہ واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے شادی کرنے کی رغبت بھی تھی اور شادی کے بعد آپ ان سے محبت بھی کرتے تھے، اور دوسری ازواج مطہرات کی طرح باریوں کی تقسیم میں ان سے مساوات بھی برتی تھی، مگر انھوں نے خود بطیب خاطر اپنی باری حضرت عائشہ رضی کو دیدی تھی۔[1]

۱۶۔ رسول اللہ صلعم کی بعثت عامہ | مارگولیتھ مدعی ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے کوئی خط جزیرۂ عرب کے باہر کے بادشاہوں اور امرا کو نہیں لکھا (تاریخ اسلام جلد ا ص ۱۵)، میور کہتے ہیں کہ آپ نے بعثت سے لے کر وفات تک عربوں کے سوا کسی اور ملک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔" بروکلمن نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ کہتے ہیں " یہ ثابت کرنا آسان نہیں جب کہ نبی خود باور کرا رہے تھے کہ وہ عالمی پیغمبر ہیں اور انھیں ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی دعوت دی گئی ہے۔" (تاریخ الشعوب الاسلامیہ ج، ص ۱۱)

قرآن مجید نے خود ہی بعثت نبوی کی صحیح نوعیت اس طرح واضح کر دی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً	ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں

[1] حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت سودہ رضی جب بوڑھی ہو گئیں تو ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلعم طلاق دیدیں اور وہ شرف صحبت سے محروم ہو جائیں، اس بنا پر انھوں نے اپنی باری خوشی خوشی حضرت عائشہ رضی کو دیدی اتنی سی بات کو مستشرقین نے افسانہ بنا دیا کہ آنحضرت کو اور بیویوں کی طرح ان سے محبت نہ تھی اور آپ نے ان سے عملاً اپنا تعلق ختم کر لیا تھا، نعوذ باللہ من ہفواتہم۔

لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا۔ ۲۸)	کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔

نیز:-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً	ہم نے تمکو نہیں بھیجا مگر ساری دنیا کے لیے
لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (انبیاء۔ ۱۰۷)	رحمت بنا کر۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت جابر رضی کے واسطے سے آپ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی	مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے
کان کل نبی یبعث الی قومہ	کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، ہر نبی خاص اپنی ہی
خاصۃ وبعثت الی کل احمر	قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں ہر کالے گورے
واسود۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ)	(ساری دنیا) کے لئے مبعوث ہوا۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا:-

فضلت علی الانبیاء بست،	مجھے دوسرے نبیوں پر چھ چیزوں کی وجہ سے
اعطیت جوامع الکلم ونصرت	فضیلت دی گئی، مجھے جوامع الکلم عنایت
بالرعب واحلت لی الغنائم	ہوئے اور رعب اور دھاک کے ذریعہ فتح
وجعلت لی الارض طھورا و	و نصرت دی گئی اور مال غنیمت میرے لیے
مسجدا وارسلت الی الخلق	حلال کیا گیا اور تمام روئے زمین میرے لیے
کافۃ وختم بی النبیون۔	پاک اور مسجد بنائی گئی اور میری بعثت
(صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ)	تمام دنیا کی طرف ہوئی اور میری ذات سے

۱۷۔ اسلامی فتوحات | ڈاکٹر منگم۔ سنت نبوی سے ناقص واقفیت کی بنا پر بہت سی حدیثوں کے منکر ہیں۔ اور انھیں خلفاء اور جنگی قائدوں کا اضافہ بتاتے ہیں، ان کی متابعت اور ہمنوائی

کرنے والے وہ مستشرقین بھی بڑی تعداد میں ہیں جو آنحضرتؐ کو حدیثوں کی وجہ سے ہدفِ طعن بناتے ہیں اور خاص طور پر ان حدیثوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو مطعون بھی کرتے ہیں، اور ان کا انکار بھی کرتے ہیں، جن میں قیامت سے قبل کے واقعات کا ذکر ہے، یا اسلامی فتوحات کے بارہ میں پیشنگوئی کی گئی ہے، جیسے وہ حدیثیں جن کی امام مسلم نے اپنی صحیح میں تخریج کی ہے۔

اس طرح کی ایک حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا،

نصرت بالرعب وبینما انا	میری رعب اور دھاک کے ذریعہ مدد
نائم اتیت بمفاتح خزائن	کی گئی، خواب میں مجھے زمین کے خزانوں
الارض فوضعت بین یدی	کی کنجیاں دی گئیں اور وہ سب میرے
قال ابوھریرۃ ... فذھب	آگے رکھ دی گئیں۔ حضرت ابوہریرہؓ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا تو انتقال
وانتم تنتثلونھا۔	ہوگیا، مگر تم لوگ زمین کے خزانے
صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ	نکال رہے ہو۔

اسی طرح ایک حدیث میں فتح قسطنطنیہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اور بعض دوسری حدیثوں میں فارس و روم کی فتح اور دجال پر غلبہ کا ذکر ہے۔

مستشرقین کے نزدیک یہ سب حدیثیں درست نہیں جو ان کے قلتِ علم اور حدیث کی ناقص واقفیت کا نتیجہ ہے۔

۱۸۔ جہاد ڈر منگھم کے نزدیک جہاد کا حکم صرف نبیؐ کی زندگی تک کے لئے تھا وہ آیات جہاد کو عام نہیں مانتے۔

اس غلطی میں وہ سب مستشرقین شریک ہیں، جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام تلوار سے

پھیلا اس کا مغربی استعمار نے اس ڈر سے کہ اسلام دنیا کو نیست و نابود کر دے گا، خوب پروپگنڈا کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی آیتیں دو طرح کی ہیں، ایک تو وہ ہیں، جو مخصوص و متعین غزوات مثلاً بدر، احد اور خندق وغیرہ کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں، دوسری طرح کی آیات کا تعلق کسی خاص غزوہ سے نہیں ہے، بلکہ ان میں دوام و استمرار کی شان پائی جاتی ہے، اس لئے وہ دائمی ہیں، بلکہ متعین غزوات کے بارہ میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی علمائے تفسیر کا یہی خیال ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں لفظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا، اور خاص سبب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح جہاد اور اس کے فضائل سے متعلق حدیثیں بھی دائمی ہیں۔

ان دلائل و شواہد کی موجودگی میں کون ان مستشرقین کی باتوں کو باور کرے گا۔

۱۹۔ غزوۂ حنین ڈر منگھم لکھتے ہیں "غزوۂ حنین کے خاتمہ کے بعد لوگ قیدی عورتوں پر پل پڑے"۔ یہ دعویٰ کتبِ سیر کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، تاریخ طبری اور سیرت ابن ہشام میں ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ اور مال غنیمت کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں" (تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۱ و ابن ہشام جلد ۲ ص ۴۹۴)

ابن جریر طبری دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"آپ نے طائف کی روانگی کے وقت ہوازن کے اسیروں کے بارہ میں حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں، ان کے کچھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کا ایک وفد خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر عرض گذار ہوا کہ اللہ کے رسول ہم لوگ مصیبت زدہ ہیں۔ ہم پر احسان کیجئے، ارشاد ہوا تمہاری اولاد اور تمہاری عورتیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں، یا تمہارا مال و اسباب؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے ... پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور

بنی عبد المطلب کے حصہ میں جو کچھ تھا، واپس کر دیا، اس طرح اور لوگوں نے بھی ان کی اولاد اور عورتوں کو واپس کر دیا۔" (تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۹۶)

ابن اثیر فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں اور مال غنیمت کو جعرانہ میں جمع کرنے کا حکم دیا اور بدیل بن ورقا خزاعی کو ان کی نگرانی کے لیے مامور فرمایا۔" (کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۲۶۶)

ان تصریحات سے تو یہ معلوم ہوا کہ غزوۂ حنین کے بعد قیدی عورتوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی، بلکہ ان کی مکمل حفاظت کے خیال سے انھیں جعرانہ جیسے دور دراز مقام پر رکھا گیا، اور بدیل بن ورقا کو ان کی نگرانی سپرد کی گئی، پھر قبیلہ ہوازن کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا گیا، اس تمام حسن کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان پر دست درازی کی گئی سبحانک هذا بهتان عظيم۔

یہ اور اس طرح کی بیشمار غلطیاں مستشرقین بالقصد اس لئے کرتے ہیں کہ اسلام اور ہادی عظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ہدف طعن و تشنیع بنائیں، انھیں مستشرقین کی فروگذاشتیں اور خطائیں کہکر ہم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتے، ان کا مقصد تو شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے۔

کیا علامہ محمد اقبال یورپ کے فلسفہ سے متاثر ہوئے

از

سید صباح الدین عبد الرحمن،

"یہ مقالہ برجستہ لکھ کر قائد اعظم اکیڈمی کراچی کی ایک خصوصی نشست میں ۳۰ نومبر ۱۹۸۳ء کو پڑھا گیا" "ص-ع"

صدر محترم و معزز حاضرین!

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ لوگوں نے یہاں طلب کر کے اپنے سے ملنے ملانے کا شرف عطا کیا، اور علامہ محمد اقبال پر مجھ کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیا، پہلے میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی علامہ محمد اقبال سے متعلق جو رائے رکھتے تھے، اس کو سماعت فرمائیں، جب علامہ محمد اقبال کی وفات ہوئی، تو انھوں نے **معارف** کے شذرات میں یہ تحریر فرمایا۔

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو (عمر کی ۶۱ بہاریں دیکھ کر) اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہو گئی، ایسا عارف، فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پروانہ بال جبریل تھا،

اس کی فانی عمر ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر ابرِ عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبولِ مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے۔ خداوندا! اس کی غم خواری فرما، اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر، اس کی تصنیفات زمانہ میں باقی رہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ زندہ رہیں گی، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، ان سے نظریے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندۂ جاوید، اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کے ٹکڑوں کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کا محرم اور رموزِ شریعت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا ساغر تیار کرتا تھا، اقبال، ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا محرم اقبال، کاروانِ ملت کا رہنما اقبال، رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک۔

حضرات! ہم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تمام شاگردوں کی طرح علامہ محمد اقبال سے متعلق جو کچھ تحریر بھی لکھتے ہیں، اسی ایجاز کا اطناب، اسی اجمال کی تفصیل اور اسی اختصار کی توضیح کرتے ہیں۔ جب ہم کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنے تمام افکار کی اساس یورپ کے فلسفہ پر رکھی، یا انھوں نے نٹشے سے استفادہ کیا، یا ان کے اور برگساں کے فلسفے میں بڑی مشابہت ہے، یا ان کے فکری دلائل روآئس، اشدل، کانٹ اور شوپنہار کی طرح ہیں تو ہمارا دل کہہ اٹھتا ہے کہ اس سے بڑھ کر اقبال کی اہانت

نہیں کی جا سکتی ہے، اور یہ توہینِ مشرق اور ہندوستان کے ساتھ اسی طرح کی جاتی ہے، جس طرح کہ انگریزوں کے زمانہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مغلوں کے زمانہ کی نادرۂ روزگار عمارت تاج محل کو استاد عیسیٰ، استاد موسیٰ اور استاد حامد نے نہیں تعمیر کیا، بلکہ اس کے بنانے والے اطالوی معمار تھے، علامہ محمد اقبال کو فرنگی فلسفہ کا خوشہ چیں بنانے والے قلمی صناع یا تو اپنی تحریری صنعت گری یا کاریگری دکھانے کی خاطر ایسا کچھ لکھ جاتے ہیں، یا وہ علامہ محمد اقبال کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے قاصر ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح تاج محل مسلمانوں کے فنِ تعمیرات میں نادرۂ روزگار اور ان کی ذہنی اختراع کا شاہکار ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری اسلامی افکار کا تاج محل ہے، جس طرح تاج محل کی پچی کاری، مرصع کاری اور مینا کاری میں مسلمانوں کے ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری کے گنبدِ مینائی پر اسلام کے افکار ہی کی کوکبی اور مہتابی کی رعنائی چھائی ہوئی نظر آئے گی، اور جس طرح تاج محل کے باوقار حسن میں اس کے قرآنی آیتوں کے کتبے سے اضافہ ہوگیا ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری میں قرآن پاک کی تعلیمات کی اصلی اور حقیقی روح کارفرما ہے،

انھوں نے یورپ کے قیام میں فرنگی فلسفیوں کا مطالعہ ضرور کیا، لیکن ان کے افکار سے متاثر ہونے کے بجائے ان سے بیزار ہوتے چلے گئے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا، تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے، (اقبال نامہ ص ۱۳۰) اسی کا اثر ہے کہ وہ نٹشے کے قلب کو مومن لیکن اس کے دماغ کو کافر کہتے ہیں، وہ یہ بھی رقمطراز ہیں کہ نٹشے نے اپنے خیالات کا ایک بتخانہ تعمیر کیا، وہ حلاج ضرور بنا لیکن اس کو دار و رسن نصیب نہیں ہوا، اس کے افکار بظاہر عظیم تھے، مگر اس کے افکار ہی نے یورپ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے

رکھ دیا، وہ راہ داں نہ ہو سکا بلکہ اپنی مستی میں خدا سے کٹ کر خود سے بھی کٹ گیا، ہیگل کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ چراغ لے کر آفتاب کو ڈھونڈنے والا رہا، جب انھوں نے اس کا مطالعہ شروع کیا تو اس کے افکار کے دریا میں ان کی عقل کی کشتی طوفان میں پڑ گئی، اس نے اپنے سکر سے قوموں کو مسموم کر دیا، وہ خود سو گیا، اور ذوقِ عمل سے محروم رہا،

گوئٹے کو رمزِ عشق سے آشنا، برگسان کو بستۂ اوہامِ باطل، ٹالسٹائے کو خود پرست فلسفی، کارل مارکس کو رازدان جزو کل ہونے کے باوجود نامحرم خویش، لاک کو تہی جام تصور کرتے رہے، فرنگی فلسفہ کو مجموعی حیثیت سے حجت نااستوار کہتے ہیں اس پر یہ لکھ کر استہزار کیا ہے کہ اس میں جلوہ ہے لیکن جلوۂ بے کلیم ہے، شعلہ ہے لیکن شعلۂ بے خلیل ہے، خرد ہے لیکن یہ متاعِ عشق کی غارت گر ہے،

اور جب اپنی کتاب Reconstruction of Religious thoughts in Islam (اسلام میں مذہبی خیالات کی تشکیل جدید) لکھی تو اس میں اور بھی کھل کر ان فرنگی فلسفیوں پر حملہ آور ہوئے، افلاطون نے سقراط کا ارشد تلمیذ بن کر تصور شعور کو حقارت کی نظر سے دیکھے جانے کی کوشش کی کہ اس سے رائے کا تو استنباط کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے حقیقی معلومات حاصل نہیں ہوتی ہیں، علامہ محمد اقبال نے ان خیالات کو قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیا اور فرمایا کہ قرآن نے سماعت اور بصارت دونوں کو بیش بہا ربانی عطیات کہا ہے ان دونوں کو اپنی دنیاوی سرگرمیوں میں خداوند تعالیٰ کا جوابدہ گردانا ہے، (ص ۴) ارسطو نے سرگرم عقل کی بقائے دوامی کا نظریہ قائم کیا، تو فرانس اور اٹلی کی زندگی پر اس کے غیر معمولی اثرات پڑے علامہ محمد اقبال نے اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور کہا کہ قرآن نے انسانی خودی کی جو قدر اور منزل متعین کی ہے، اس کے برخلاف ارسطو کا نظریہ ہے (ص ۴)

کانٹ کو شہرت اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے فلسفیانہ اصولوں میں ہمواری اور یکسانیت ہے لیکن علامہ محمد اقبال کو وہ اس لئے پسند نہیں آیا کہ وہ خداوند تعالیٰ کے وجود کے امکان کی تائید نہ کر سکا، (ص ۵) وہ کانٹ کو اس لئے بھی ناپسند کرتے ہیں کہ جدید فلسفہ کی رو سے علل و اسباب کے اس کے مباحث میں بہت سے گمراہ کن دلائل ہیں، (ص ۱۰۱) وہ کانٹ سے اس لئے بھی ناخوش ہیں کہ اس کا خیال ہے کہ نیکی اور مسرت، فرائض اور رجحانات متضاد تخیلات ہیں (ص ۱۱۳) اقبال پروفیسر میکڈ انلڈ کو اس لئے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے کہ اس کے یہاں عارفانہ اور پیمبرانہ شعور اور احساس میں جو نفسیاتی اختلافات ہیں اُن کے بنیادی تصورات سے وہ بے خبر ہے، (ص ۱)

ولیم جیمس کا خیال ہے کہ عارفانہ کیفیت جب عقلیاتی شعور سے جدا ہو جاتی ہے تو یہ انسان کے نارمل شعور کو قطع کر دیتی ہے، علامہ محمد اقبال اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سراسر غلط قسم کا استدلال ہے، علامہ محمد اقبال فرائڈ کے نفسیاتی نظریے کی مذمت یہ لکھ کر کرتے ہیں کہ یہ کسی قابل قبول شہادت پر مبنی نہیں ہے، نئے ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ نئے نفسیاتی طریقے سے اس بات کی تشریح کی جا سکتی ہے کہ مذہبی Knowledge محض Passion کی ایک قسم ہے، علامہ محمد اقبال ان کی مخالفت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس قسم کی کوشش لاک اور ہیوم کی مساعی کی طرح رائگاں ہو کر رہ جائیں گی، (ص ۲۶) برگسان کا خیال ہے کہ اصلی خواہش اور اصلی خیالات میں ناقابلِ حل ثنویت ہے علامہ محمد اقبال اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسے خیالات اسی وقت قائم کئے جا سکتے ہیں، کہ جب عقل سے متعلق (Partial view) ادھوری رائے رکھی جائے ص ۵۲

میک ٹگارٹ کا خیال ہے کہ زمان ایک غیر حقیقی چیز ہے کیونکہ ہر شے کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل وابستہ ہے، علامہ محمد اقبال اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ میک ٹگارٹ کی یہ دلیل ہے کہ مستقبل کا انحصار محض ایک کھلا ہوا امکان ہے، یہ کوئی حقیقت نہیں، علامہ محمد اقبال کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ان کے

خیال میں حال اور مستقبل کا ماضی کے ساتھ لازم ملزوم ہونا ضروری نہیں، فرنل کا بیان ہے کہ حقیقت ایک مبہم وسیع pervasive cosmic light) ہے جس کی مثال نور ہے، علامہ محمد اقبال اس سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ مذہب کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بعض مذہبی خیالات کی بنا پر وحدت الوجود کا تخیل بروئے کار آیا لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق فرنل کی رائے صحیح قرار نہیں دی جا سکتی ہے، اسپنگلر نے اپنے فلسفیانہ انداز میں مسلمانوں کے تصور زمان کے تخیلات کا تجزیہ کیا تو علامہ محمد اقبال نے اس کو یہ کہکر رد کیا کہ اس نے صحیح اسلامی تصورات سے استفادہ کرنے کے بجائے مسلمانوں کے عامیانہ خیالات کی ترجمانی کی ہے، اس نے اس کو جس طرح پیش کیا ہے وہ عجیب وغریب ہے، وہ انا کے اسلامی تصور کو مطلق نہیں سمجھ سکا ہے (ص ۱۴۴-۱۴۳) علامہ محمد اقبال فرنگی فلسفۂ جنگ سے آزردہ رہے کہ اس نے مذہب کی بنیادی اساس کی وجہ سے انسانیت کو جو نشو ونما ہوئی ہے اس کی اصلی روح کو وہ سمجھ نہ سکا، اور اپنے تمام اصولوں میں تضاد اور ان سے انحراف کرکے مذہب کی ایسی بحث چھیڑ دی ہے جس سے ذہن کو ایک مایوس کن اور غلط سمت میں لے جاکر چھوڑ دیا ہے، اور اپنے نظریوں کا انبار لگا کر مذہب کی نوعیت سے سراسر غلط فہمی پیدا کر دی ہے، علامہ محمد اقبال کا یہ خیال تھا کہ یورپ کی لادینیت دین کے خلاف ایک بغاوت ہے، لیکن یہ لادینیت خود ایک دین بن گیا ہے، جس میں بھیڑ کا بچہ بھیڑیے کے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔

علامہ محمد اقبال اس کے بھی قائل نہیں کہ یورپ کے سارے فلسفیانہ خیالات ان کے اپنے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر ان کے سارے فلسفیانہ خیالات کا تجزیہ کیا جائے، تو سب میں مسلم حکماء کی کچھ نہ کچھ خوشہ چینی پائی جائے گی، یورپ کا تجرباتی طریقہ Exoerimental methed عربوں کا رہین منت ہے، یورپ میں زمان ومکان

کا جب تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا، تو بقول علامہ محمد اقبال عراقی کے یہاں اس مسئلہ پر پوری بحث ملتی ہے، علامہ محمد اقبال نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ نگاری کے نظریہ کے سلسلہ میں زمان کی حقیقت اور زندگی کے تصور میں دونوں کا جو تسلسل اور اتصال دکھایا ہے، اس کو پڑھ کر فرنگی فلسفی (FLINT) فلنٹ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سلسلہ میں افلاطون، ارسطو اور اگسٹن تو ابن خلدون کے ہم مقابل سمجھے جا سکتے ہیں، بقیہ اور فلسفیوں کو ابن خلدون کے بغل میں جگہ نہیں دی جا سکتی ہے (ص ۱۴۴)

ان باتوں کی طرف توجہ دلانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ علامہ محمد اقبال یورپ کے فلسفیوں کی گاڑیوں کے حمال نہ تھے، بلکہ وہ تو اس کے قائل تھے کہ خود یورپ کے فلسفی مسلمان فلسفیوں کی گاڑیوں کے قلی ثابت کئے جا سکتے ہیں، وہ تو فرنگیوں کی دلآویزی، شیرینی، پرویزی سے پناہ مانگتے رہے، کیونکہ ان کی نظر میں یہ خنگیزی کے سوا کچھ بھی نہیں، ان کے کانوں میں کبھی آواز پڑ جاتی کہ انھوں نے مغرب کے فلسفیوں سے استفادہ کیا ہے، تو ان کو بڑا دکھ ہوتا، اور اس کا اظہار اپنی دکھ بھری آواز میں اس طرح کیا ہے کہ فرنگی بتوں کو انھوں نے دل ضرور دیا، مگر ان کے دیرنشینوں میں اپنے کو پگھلا ہوا پایا، اس طرح کہ اپنے سے ایسا بیگانہ ہو گیا کہ اپنے کو دیکھ کر پہچان نہ سکا،

بہ فرنگی بتاں دل باختم من	زتابِ دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بودم من	چو دیدم من خویشیں نشناختم من

پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب کے میخانہ سے مے ضرور چکھی، مگر اس کو چکھ کر دردِ سر مول لیا، ان فرنگیوں کے ساتھ بیٹھا بھی، مگر احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دن بے سود ہی گذرے

مے از میخانۂ مغرب چشیدم	بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی	ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

ان حقائق کے بعد اگر کوئی پوچھے کہ ان کے افکار کا آخر کونسا سرچشمہ تھا، تو یہ کہنے میں تامل نہیں کہ قرآن پاک" اقبال نے فرنگی فلسفہ کا مطالعہ ضرور کیا لیکن اس کا ردِ عمل ان پر اچھا نہیں ہوا اسی لئے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا کہ ان کا مسلک وہی رہا جو قرآن کا ہے اسی کو ہمارے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اس طرح ادا کیا ہے، کہ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتے تھے، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا ساغر تیار کرتے تھے۔

علامہ محمد اقبال کو قرآن میں وہ سب کچھ ملا جن کی ان کو تلاش تھی، ان کے خیال کے مطابق کہ قرآن ہی نے انسان کو اس کے اس اعلیٰ شعور کا احساس دلایا ہے، کہ خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے گوناگوں رشتے ہیں، (ص ۸) اور خود علامہ محمد اقبال کو قرآن ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کائنات کسی تخلیقی تفریح کے نتیجہ میں ظہور میں نہیں آئی، بلکہ یہ ایک قابلِ قدر حقیقت ہے۔ یہ اس کی تخلیق میں بے پناہ بینائی اور وسعت مضمر ہے، (ص ۱۰) اسی کے مطالعہ سے ان کو معلوم ہوا کہ حقیقت کی کوئی اور شکل اتنی طاقتور اتنی حوصلہ افزا اتنی خوبصورت نہیں جتنی کہ انسان کی اسپرٹ ہے، وہ تخلیقی سرگرمیوں کا پیکر ہے جس میں بلندی تک پہنچنے کی قوت عطا کی گئی ہے۔ اور جب وہ متحرک ہو کر کوچ کرتا ہے تو ایک وجود کو چھوڑ کر دوسرے وجود کو طے کرتا جاتا ہے، اس کے اردگرد جو کائنات نظر آتی ہے، اس میں اس کے حوصلے منتقل ہو جاتے ہیں، پھر وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے، اور اپنی تقدیر کا معمار بن کر خود کائنات کی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے، اور جب اس کائنات میں نئی قوتیں ابھرتی ہیں تو ان قوتوں کو اپنے عمل کی سرگرمیوں سے اپنے قابو میں کر لیتا ہے، اور ان کو اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے مصرف میں لاتا ہے، جس کے بعد خود خدا اس کا شریک کار بن جاتا ہے

مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان خود اپنی اس قوت کو بروئے کار لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے، ان کو قرآن پاک ہی سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اس شعور کو بیدار رکھا ہے، جس کا مظہر وہ چیز ہے جس کو تجربہ کہا جاتا ہے، قرآن میں وہ ساری باتیں ہیں جن کو آج کل کے سائنسداں (Emperical attitude) کہتے ہیں اور اسی (Emperical attitude) کو اللہ تعالیٰ صحیح سمت میں ڈال دیتا ہے، تو انسان سائنس کے انکشافات کرنے لگتا ہے، (ص ۱۴۳) قرآن ہی نے بتایا کہ جب انسانی ذہن تبدیلی چاہتا ہے اور اس تبدیلی پر قابو پا کر اس کا صحیح مصرف لیتا ہے تو وہ ایک پائدار تمدن کا مالک بن جاتا ہے، (ص ۱۴۴) ان کو قرآن ہی سے معلوم ہوا کہ جب زمان ایک (Organic whole) یعنی نامیاتی کل میں تبدیل ہونے لگتا ہے تو اسی کا نام تقدیر پڑ جاتا ہے، اور وہ دعوی کرتے ہیں کہ خودی اور انا کا تخیل ان کو سورۂ اخلاص سے ملا جو ان کے خیال میں انسان سے ایسے ہی وابستہ ہے جیسے اس کی گردن کی رگ اس کے ساتھ ہے، خودی میں مصطفائی، خودی میں کبریائی، اور خودی کی زد میں ساری خدائی کا راز بھی ان کو قرآن پاک ہی میں ملا، رموز بے خودی اور (Reconstruction) میں سورۂ اخلاص کی جو وضاحت و تشریح ہے اس سے ان کے ان خیالات کا اندازہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ وہ تمام عمر قرآن پڑھتے رہے، قرآن سے متعلق سوچتے رہے، اور قرآن ہی کی مدد سے سب کچھ کہتے رہے اور یہ جو ان کے عشق کا فلسفہ ہے اس کا سرچشمہ کہاں پایا جاتا ہے، وہ جب جمالِ عشق، جلالِ عشق، کمالِ عشق، اور زوالِ عشق کی داستان بیان کرتے ہیں، یا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ، عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام، عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام، عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود،

عشق نغمۂ تارِ حیات، عشق نورِ حیات، عشق نارِ حیات ہے، تو یہ عشق کون سا عشق ہے؟ کسی لیلیٰ کسی عذرا، کسی شیریں کا نہیں، بلکہ عشقِ الٰہی ہے، جس میں سرشار ہو کر یہ بھی کہہ گئے ہیں،

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ‎ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اس کو ایک نئے حلاج کی شطحیات سمجھیں، یا عشقِ الٰہی کی سوز نا کی جو ان کو قرآن ہی سے ملی پھر اسی سرشاری میں وہ انسان کے متعلق کہہ اٹھے ہیں،

ع :- ہستی او ظلِ اسمِ اعظم است،

اور اسی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں، کہ خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے اور وہ کائنات کی ہر چیز میں آدمی کو تلاش کر رہا ہے، آدمی کو لالہ اور نرگس کی دل آویزیوں، پرندوں کے سینوں، پھولوں کی خوشبوؤں، دنیا کی ہر چیز کی رنگینیوں، محلوں وادیوں اور ماہتاب کی کرنوں میں ڈھونڈتا ہے، زندگی کا موتی انسان کے جسمِ خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے، اور اب یہی فیصلہ کرنا ہے کہ یہ دنیا خود آدمی ہے یا خداوند تعالیٰ ہے،

ع :- ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

انسان کا یہ مرتبہ علامہ محمد اقبالؔ نے جو بلند کیا ہے وہ قرآن ہی کی تعلیم کی بنا پر ہے، اس کو سمجھ کر ہم کو اور آپ کو اپنے کو سمجھنا ہے، ان کا پیام ہے کہ مسلمانوں کا زیستن اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے زیستن کو قرآن سے منسلک نہیں کریں گے،

قرآن پاک کے بعد علامہ محمد اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، آپ کی رسالت کو وہ جہاں کی تکوینِ دین اور آئین قرار دیتے ہیں، آپ کی کتاب کو قلبِ مومن کی قوت، آپ کی حکمت کو حبل الورید ملت سمجھتے ہیں بعض اسباب کی بنا پر ان کی حاضری مدینہ منورہ میں تو نہ ہو سکی لیکن آخر وقت میں ارمغانِ حجاز میں مدینہ منورہ کا جو خیالی سفر

کو منظوم کیا، وہ دنیا کے شعر و ادب کے شاہکار میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ وہاں پہونچنے سے پہلے اپنے کو شہیدِ جلوہ سمجھتے ہیں، ان کا قدم مستانہ وہاں کے صحرا پر پڑتا ہے، تو اس کی ریگ ان کو حریر معلوم ہوتا ہے، اس کو مقامِ عشق و مستی کی منزل، شانِ جمال، زمانِ جاوداں کی وادی، تب و تابِ دل، میخانۂ شوق، رات کی تاریکی میں تابِ ماہ، ضمیرِ زندگی، شریکِ دردِ و سوزِ لالہ قرار دیتے ہیں، اور پھر پرنم آنکھوں کے ساتھ ملتجی ہوتے ہیں کہ

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے،

اور آپ سے کیا مانگتے ہیں:

زسوزِ ایں فقیرِ رہ نشینے ‎ بدہ او را ضمیرِ آتشینے

دلش را روشن و پایندہ گرداں ‎ زامیدے کہ زاید از یقینے

اور یہی ضمیرِ آتشیں اور دلِ روشن اپنے کلام میں منتقل کرتے رہے جسکو ہم صحیح طور پر سمجھیں تو ہم اپنے کو بھی سمجھا سکیں گے،

صحابۂ کرام میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شمعِ رسالت کے گرد جو پروانہ کا عشق دکھایا، اور اس عشق و محبت میں جو استواری دکھائی، اس سے بھی علامہ محمد اقبال متاثر ہوئے، ان کو خواب کے ذریعہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی نے بشارت دی کہ سورۂ اخلاص کے ذریعہ سے ان کو زندگی کی تب و تاب حاصل ہو سکتی ہے، وہ آئینِ صدیقؓ و عمرؓ کی تجدید چاہتے رہے، وہ حضرت عمرؓ فاروق کے فقر و سلطانی، خلافت اور تاج و سریر، جہانگیری اور خاک نشینی کی حسین آمیزش کو اسلامی مملکت کا صحیح تصور جانتے رہے، حضرت علیؓ کے عشقِ رسول کو سرمایۂ ایمان، ان کی تلوار کو قوتِ دینِ مبین، ان کے نام کو سرِّ زندگی سمجھتے رہے، انہوں نے حضرت بلالؓ کی فطرت کو نورِ نبوت سے مستنیر پایا، حضرت ابن مسعودؓ کو چراغ افروزِ عشق سمجھتے رہے، حضرت سلمان فارسیؓ کو اسبابِ دام و احکام سے فارغ زادۂ اسلام قرار دیا، حضرت بو ایوبؓ کے دردِ دل اور آہِ نیم شبی کے قدردان

رہے، حضرت خالد بن ولید کی قوت بازو اور جبر کے معترف تھے، انہوں نے ردائے فاطمہ زہراؓ
کی عفت میں مخدرات اسلام کے اصلی ناموس اور ان کی امومت میں نسوانیت کا اصلی جوہر پایا۔

پھر بڑے فخر کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے، کہ وہ شروع سے آخر تک رمز آشنائے
روم رہے، ان ہی سے راز زندگی اور سر مرگ ان پر فاش ہوا، ان ہی سے سرور پا کر مقام کبریائی
کا سرور حاصل کیا، ان ہی کے فیض سے ان کے سبو میں جیحون منتقل ہوا، ان ہی کی آتش سوز
سے ان کا علاج ہوا، اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی اعتراف ہے، کہ انھوں نے حضرت فضیلؒ اور
حضرت ابو سعیدؒ میں پاک مردانگی پائی، حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب
دیکھا، منصور کے عرفان کی تجلیوں میں فطرت کی تجلی دیکھی، حضرت سید احمد رفاعیؒ کے ضمیر سے
نور کو کسب کرنے کی فکر کی، حضرت علی ہجویریؒ کو مخدوم امم، پاسبان عزت ام الکتاب
قاصد طیار عشق قرار دے کر کہتے ہیں کہ ان ہی کے جمال کی وجہ سے عہد فاروقی کی یاد تازہ ہوگئی
اور خاک پنجاب زندہ ہوگئی، انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل بے تاب اور درد
ناشکیبائی میں ایک خاص کیفیت محسوس کی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی قبر کی زیارت میں دل کی
زندگی پائی، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ ان کو شعور ولایت اور شعور نبوت کا فرق معلوم
ہوا، حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی خاک کو زیر فلک مطلع انوار سمجھا، اور ان کو صاحب
اسرار تصور کر کے ان سے چشم بینا کے ساتھ چشم بیدار کے خواہاں ہوئے۔

حکمائے اسلام میں امام غزالی کی طرف ان کی نظر اٹھی، بو علی سینا کے مقام فکر تک پہنچنے
کی کوشش کی، سنائی کے صدق و اخلاص کے جویا ہوئے، حیرت فارابی سے متحیر رہے، نظریۂ
نور سے متعلق ان کے خیال کو ابن رشد سے تقویت پہنچی، ابو الدولہ سمنانیؒ اور جنید بغدادیؒ
کے خیالات اپنے اشعار میں منتقل کیے، ابن خلدون نے انسانی نفسیات کو سامنے رکھ کر زندگی اور

دان سے جو بحث کی ہے، اس سے بھی استفادہ کیا، وہ شاہ ولی اللہ کا احترام اس لیے کرتے ہیں
کہ انھوں نے اس برصغیر میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں جلا پیدا کی، وہ جمال الدین افغانی
کی حق گوئی، حق بینی اور تجلی ہائے فکر سے بھی متاثر تھے، سر سید احمد خاں نے اس برصغیر میں جو نئی
زندگی پیدا کی اس کا بھی اثر ان پر رہا۔

مسلمان حکمرانوں میں حشم فاروق اعظمؓ اور ان کی شان محبوبی کے رطب اللسان رہے، ہارون
رشید کے ساتھ طغرل و سنجر کے آئین جہانبانی کو سراہا ہے، صلاح الدین ایوبیؒ کی تلوار کی تعریف
میں لکھا ہے، کہ اگر تیغ ایوبی کے ساتھ نگاہ بایزید مل جائے تو یہ ہر دو عالم کے گنج کی کلید ہوجائے،
ان کو فخر رہا کہ دولت عثمانیہ کے سلطان محمد فاتح نے بازنطینی سلطنت پر ضرب کاری لگائی۔ ترکی کے
حلیم پاشا کی عزت ان کے دل میں اس لیے رہی کہ ان کا پیغام تھا کہ:

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است — چشم شاں صاحب نظر دل مردہ است

وہ اس برصغیر کے مسلمان حکمرانوں میں قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کی پامردی کی
تعریف کرتے ہیں، وہ بابر کے مزار پر حاضر ہوئے تو پکار اٹھے کہ یہ بادشاہ خوش نصیب ہے کہ اس
جگہ مدفون ہے جو طلسم فرنگ سے آزاد ہے، اورنگ زیب کی تعریف میں ان کا قلم چلا تو چلتا گیا
اس کو اعتبار دودمان گورگان، شعلۂ توحید کا پروانہ، اور صف شاہنشاہاں میں یکتا کہتے ہیں،
اور پھر اس کے بارے میں یہ لکھ کر تو ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں، کہ

درمیان کارزار کفر و دین — ترکش ما را خدنگ آخرین

وہ ٹیپو سلطان کا بھی احترام کرتے ہیں، ان کے خیال میں وہ یہ پیام چھوڑ گیا ہے کہ:

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

مسلمان فاتحوں میں طارق بن زیاد کے حالات اور کارنامے پڑھ کر ان پر نشاط طاری

ہوگیا ہے، اور یہ لکھا ہے کہ یہ غازی، یہ پراسرار بندہ جس کو ذوقِ خدائی بخشا گیا تھا، یہ دعا کر گیا ہے:

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

وہ محمود غزنوی کو بھی بہت پسند کرتے تھے کہ اسکی تیغ بے زینہار کی یلغار سے دشت و در کانپ اٹھا تھا، سخن گوئی میں شیخ فریدالدین عطار سے متاثر ہوئے، عراقی کے اشعار سے لذت آشنا ہوئے، حدیث بوعلی قلندر پانی پتی میں گل رعنا کی دل آویزی دیکھی، اللہ تعالیٰ سے امیر خسرو کے سینہ کے آتشدان کے سوز کے طلبگار ہوئے، اپنے کو کشتۂ انداز جامی قرار دیا، عرفی کی غیرت اور تخیل، اور فیضی کی توانائی اور جوش کو اپنایا، صائب، ملک قمی، ابوطالب کلیم، میر رضی دانش، عبدالقادر بیدل کے اشعار سے متاثر ہو کر تضمینیں لکھیں، غنی کشمیری جیسے فقیر لیکن اقلیم معنی کے امیر کی نواسنجی ان کے ذہن پر چھائی رہی، غالب اور میر کا انداز بھی پسند کیا۔

حضرات! اس سمع خراشی کا مطلب یہ ہے کہ ان حقایق کے پیش نظر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ اقبال فرنگی فلسفیوں کی گاڑی کھینچنے میں لگے رہے، ان کا فلسفۂ خودی بہت مقبول ہے، اس کو فرنگیت سے ملوث کرنا اپنی بے خبری کا ثبوت دینا ہے، اقبال خود ہی لکھتے ہیں کہ اسرار خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیہ کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور وقت کے متعلق برگسان بھی ہمارے صوفیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں، وہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ زمان و مکان پر خود ہندوستان کے مسلمان حکما، اور صوفیہ نے بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے، ان کو یہ افسوس رہا کہ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفہ کی تعلیم سے ناآشنا ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اسلام کے حکما، اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کیا جائے، ان کو

یقین تھا کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا، وہ اس پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھ سکے، لیکن اسلام کے حکما، اور صوفیائے کرام کے یہاں جو چیزیں غیر مرتب تھیں، ان کو انہوں نے اپنی شاعری میں بہت ہی طاقتور اور دل آویز طریقہ پر پیش کر کے اپنے خیالات کی کوثر و تسنیم بہا دی۔ اگر ہم علامہ محمد اقبال کو اس حیثیت سے پہچان لیں گے، تو ہم اپنے کو بھی پہچان سکیں گے۔

علامہ محمد اقبال نے قرآن مجید کے تدبر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، صحابۂ کرامؓ کی زندگی، حکمائے اسلام، صوفیائے کرام اور فرمانروایانِ اسلام وغیرہ سے جو کچھ پایا تھا، اس کو مسلمانوں تک پہونچایا، انہوں نے صداقت، عدالت، شجاعت، دنیا کی امامت، رمز مسلمانی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی، عشق کی گرمی، عشق مکاں، تجلیات کلیم، مشاہدات کلیم، قلب سلیم، نور خودی، نار خودی، خودی کی مصطفائی، خودی کی کبریائی، روح قرآنی، مومن بن کر، دین کی نفس گدازی کی تعلیم دے کر کاروان ملت کے حدی خواں اور فلسفۂ اسلام کے ترجمان بننا چاہتے تھے، مگر وہ شکستہ دل اور آزردہ خاطر ہو کر شاید اس دنیا سے رخصت ہوئے کہ وہ اس پیام سے مسلمانوں کو مرد مومن، مرد مجاہد، مرد حر اور نوجوانوں کو شاہین نہ بنا سکے، اس لیے کہ یہ لوگ ان کو شاعر اسلام کے بجائے شاعر شیوہ بیان سمجھتے رہے۔ ان کے شکوہ سے زیادہ لطف لیا، جواب شکوہ کو خاطر میں نہیں لائے، ان کی نظموں میں جگنو، شمع، چاند اور ستارے، جلوہ حسن، رات اور شاعر، پھول، محبت، عشرت امروز سے زیادہ محظوظ ہوئے، صقلیہ، بلاد اسلامیہ، کفر و اسلام، دنیائے اسلام اور طلوع اسلام کو زیادہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، سرمایہ و محنت کو غور سے پڑھا، اسی کے ساتھ زندگی اور سلطنت پر جو نظمیں کہی گئی تھیں، وہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھی گئیں، اسرار خودی کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مگر رموز بے خودی کو بھلا دینے کی کوشش کی گئی، زبور عجم کی غزلوں کی موسیقیت، ترنم، شیریں دیوانگی، اور جذبات کی پسی ہوئی

جلیوں اور بکھری ہوئی تجلیوں پر سر زیادہ دھنا گیا، مگر پیام مشرق کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی، جاوید نامہ کی اشاعت پر چراغاں ہوا کہ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کی طرح لکھنے والا ایک مسلمان شاعر بھی پیدا ہوگیا، مگر جاوید نامہ میں جو کچھ لکھا گیا، اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی، ضرب کلیم میں خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کرتے اور بال جبریل میں نفس سوختۂ شام وسحر کو تازہ کرنے کا جو پیام تھا، وہ تو نظر انداز کردیا گیا، اور اس پر بحث ہونے لگی کہ اس وقت تک علامہ محمد اقبال کی شاعری کی صناعی اور کاریگری کس ارتقائی منزل کو پہونچ گئی تھی، پس چہ باید کرد میں نگاہ مرد مومن، تطہیر فکر، حکمت کلیمی کی جو کرامت دکھائی گئی ہے، یا سیاسیات حاضر اور حرف چند با امت عربیہ کے عنوانوں سے جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، وہ نقش ونگار طاق نسیاں بنادیے گئے، یا ارمغان حجاز میں جو کچھ قلمبند کیا گیا ہے، وہ شعر وادب کی مجلس کے لیے نشاط وانبساط کا سامان تو بن گیا، لیکن جس مقصد کے لئے یہ لکھا گیا تھا، اس کی تکمیل کی کوشش نہیں ہوئی، خود علامہ محمد اقبال کو اپنی زندگی میں ان سب باتوں کا احساس ہوگیا تھا، اس لیے انہوں نے بارگاہ رسالت میں فریاد کی:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند — زشاخ نخل من خرما نخوردند
من اے میر امم داد از تو خواہم — مرا یاران غزل خوانے شمردند

یعنی مسلمانوں نے مجھ سے کچھ نہیں سیکھا، مجھ کو صرف غزل خوان ہی سمجھتے رہے، ہمیشہ انھوں نے یہ شکایت اس لئے کی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ سرمایۂ حیات کیلئے خون دل وجگر چاہیئے، اس لئے کہ فطرت لہو ترنگ ہے مگر غافل مسلمان جل ترنگ ہی چاہتے ہیں

اپنی اس مایوسی کے باوجود وہ مسلمانوں کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے، مفکر اسلام، مجدد اسلام اور متکلم اسلام ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی چھپی ہوئی صلاحیت اور دبے ہوئے جوہر سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے زمانے میں عالم اسلام پر آشوب دور سے گذر رہا تھا، پھر بھی ان کی پیشین گوئی تھی،

مسلمان گرچہ بے خیل وسپاہے است — ضمیر او ضمیر پادشاہے است
اگر او را مقام او بازبخشند — جمال او جلال بے پناہے است

مسلمانوں کا یہ بے پناہ جمال اور جلال ان کو ابتک واپس نہیں ملا ہو، کیوں؟ علامہ اقبال کی وفات سے ابتک ان کے شعری، ادبی، علمی، نظری اور فکری کارناموں کا بہت کچھ مطالعہ کیا گیا ہے، مگر وہ ابتک کتابوں، رسالوں، اخباروں، سمیناروں بین الاقوامی کانگرسوں اور موسیقی کی مجلسوں ہی تک محدود ہیں، مسلمانوں کی عملی زندگی میں کہیں نہیں دکھائی دیے، کیا اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو صرف ادبی گل کاری، قلمی صناعی اور علمی کاریگری سمجھا جائے، یا علامہ محمد اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خواب گراں سے بیدار ہوں، ناموس ازل کے امین، جبریل واسرافیل کے صیاد، ظاہر وباطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر ومہ وانجم کے حاکم، خود نگر، خودگر، خودگیر، بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم بن کر رہیں، مگر وہ اب تک نہ بن سکے، ہمارے دانشور اور اہل قلم بتائیں کہ آخر کیوں؟ شاید اس لیے کہ علامہ محمد اقبال شاعر شیریں مقال کی حیثیت سے تو سمجھے گئے، لیکن اقبال اپنے اصل جوہر کمال کے ساتھ نہیں پائے گئے، اگر مسلمان عارف باللہ اقبال، عاشق رسول اقبال، فلسفۂ اسلام کے ترجمان اقبال اور کاروان ملت کے حدی خواں اور رجز خواں اقبال کو پائیں، تو وہ خود اپنے کو بھی پالیں گے، جس کے بعد وہ کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر کبھی دریا کے سینے میں اتر کر اور کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر مقام اپنی خودی کا فاش بلکہ فاش تر کر سکتے ہیں۔

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر ایک نظر

از۔ جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی چیرمین اتر پردیش، اردو اکاڈیمی لکھنؤ

(۲)

برناوا میں جو دہلی متھرا کے راستہ پر واقع "اب ضلع میرٹھ میں شامل ہے، مزار گنبد اور خانقاہ کے آثار اب بھی موجود ہیں، مگر اب کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو تاریخی ذمہ داری کے ساتھ عہد ماضی کے مستند ماخذوں سے روشنی ڈال سکے یا دستاویزی ثبوت فراہم کر سکے۔

یہ صحیح ہے کہ برناوا میں آباد قدیم خاندان کے باقیات "انصاریان ہرات" ہی میں ہیں جس کا ثبوت ایک قدیم مخطوطے "چشتیہ بہشتیہ" سے ملتا ہے، مگر وہ علاء الدین جو علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں دسویں نمبر پر ہیں کیا علاء الدین "برناوی" ہو سکتے ہیں؟ ممکن ہے نام کے اشتراک سے دھوکا ہو بھی جائے لیکن برناوی علاء الدین کی تاریخ وفات (۸۶۷ھ / ۱۴۶۲ء) سے حقیقت حال بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اور ان کے عمود نسب کو جان لینے کے بعد غلط فہمی کا امکان بھی باقی نہیں رہنا چاہئے۔

ورقۂ نسب میں علمائے فرنگی محل شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کے بیٹے جابر مقربادی کی اولاد ہیں، اور برناوی علاء الدین شیخ الاسلام کے جن بیٹے کی اولاد ہیں ان کا نام اسمٰعیل ہے۔ شجرہ یہ ہے:

علاء الدین بن نصیر الدین بن بدر الدین بن شرف الدین بن خواجہ فضیل بن خواجہ کلاں بن خواجہ داؤد بن خواجہ حامد بن خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسمٰعیل ابن شیخ الاسلام ہروی۔

خواجہ جلال الدین (اس عمود نسب میں نویں نمبر پر) کے بارے میں "احوال علمائے فرنگی محل" میں صراحۃً لکھا ہے (اور جو بعینہٖ تذکرۂ علمائے فرنگی محل" میں نقل بھی ہو گیا ہے) کہ اس کنبے کے وہی پہلے شخص ہیں جو ہرات سے ہندوستان آئے[1]

مصنف قرۃ الابصار نے چشتیہ بہشتیہ مخطوطہ سے بعض اقتباسات نقل کرتے ہوئے جن میں علاء الدین برناوی کا مدفن شیخوپورہ راپڑی میں بتایا گیا ہے "چشتیہ" کے یہ الفاظ بعینہٖ درج کر دیئے ہیں۔

علاء الدین کے بیٹے مولانا نظام الدین تھے جو راپڑی سے اپنے بھائی کے ساتھ ہرات واپس گئے۔ پھر یہ دونوں بھائی ہرات سے واپس آئے اور برناوا میں ایک خانقاہ قائم کی پھر مولانا نظام الدین قصبۂ راپڑی چلے گئے۔ ان کی اولاد قصبۂ راپڑی کے نواح میں موجود ہے۔[2]"

ان مولانا نظام الدین ساکن راپڑی کی نسل میں ایک صاحب نواب بڈھن کے بارے میں مصنف قرۃ الابصار کا بیان ہے:

"نواب بڈھن سے راقم کی ملاقات پاک پٹن میں ہوئی تھی ..... پھر دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اپنا شجرۂ نسب اور چشتیہ بہشتیہ دیکھنے کو دی، اسی وقت بقدر ضرورت، رسالۂ "چشتیہ" کے مذکورہ اقتباسات راقم نے لے لیے تھے۔[3]

راپڑی ــــــ جہاں مولانا نظام الدین برناوا سے آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اور جس کے نواح میں

---

[1] حوالہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ ص ۸ [2] تذکرۃ الابصار (مخطوط) [3] حوالہ بالا

ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔ .... ضلع سیف پوری کی تحصیل شکوہ آباد میں ایک بستی اب بھی ہے
جہاں ایک تفریحی سفر کے سلسلے میں ایک محقق نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی
(م ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء) کو جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بعض قدیم مزارات اور پرانی عمارتیں دیکھ کر اپنے ذوق
تحقیق کے تحت انھوں نے یہ معلوم کر لیا کہ یہ مزار کس زمانے کے ہیں۔ ان کا بیان ہے :-

"جن بزرگوں کے یہ مزار ہیں ان کا اصل مسکن برناوا ضلع میرٹھ تھا۔ وہاں ایک بزرگ
علاء الدین چشتی نے اگلے زمانہ میں "چشتیہ بہشتیہ" ایک کتاب لکھی ہے اس میں راپڑی کے مزاروں
کا حال درج ہے، اس کی عبارت فارسی کا خلاصہ متعلق مقام یہ ہے :-

مخدوم بدر الدین، صاحبِ ولایت، حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد میں ہیں
..... یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ تھے، سو برس سے زیادہ عمر پا کر (۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء)
میں رحلت کی۔ ان کا مزار برناوا کے متصل پنیڈن ندی کے کنارے پر ہے۔ ان کے
صاحبزادے نصیر الدین بزرگ تھے۔ یہ اپنے والد کے خلیفہ اور مرید تھے، ۱۱ ذی الحجہ
۸۴۹ھ/۱۴۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخوپورہ راپڑی کے مزار میں ان کی قبر سنگ سرخ کے
گنبد کے نیچے ہے، ان کے دو بیٹے علاء الدین عرف بدھن کی وفات ۲ر شوال ۸۷۶ھ/۱۴۷۲ء
روز دوشنبہ ہوئی، ان کی قبر اپنے والد کی قبر کے متصل سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے، دوسرے
شیخ فرید الدین عرف شیخ فدو (وفات ۹۳۵ھ) ان کی قبر احاطے کی شمالی دیوار کے متصل
اپنے والد کے مزار کے پس پشت ہے"۔

"چشتیہ بہشتیہ" میں مذکور علاء الدین برناوی کے بیٹے "چشتیہ بہشتیہ" ہی کے اقتباس کے مطابق مولانا
نظام الدین تھے۔ جو اپنے والد ماجد کی وفات (۸۷۶ھ/۱۴۷۲ء) کے بعد ہرات (آبائی وطن) چلے گئے تھے،
وہاں سے واپس آکر راپڑی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

ان نظام الدین کے ہرات سے واپس آنے اور راپڑی میں قیام اختیار کرنے کا زمانہ کم و بیش
پندرھویں صدی عیسوی کا آخری یا سولہویں صدی عیسوی کا بالکل ابتدائی زمانہ ہوگا، گویا سکندر لودھی
(۸۹۴ھ/۱۴۸۸ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کے یہ نظام الدین معاصر تھے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدر الدین سے
(جن کی وفات سو برس کی عمر میں ۷۸۹ھ/۱۳۸۷ء میں ہوئی، اس بنا پر ان کی پیدائش ۶۸۹ھ/۱۲۸۹ء
قرار پاتی ہے)، نظام الدین تک پوری دو صدیاں محض تین پیڑھیوں میں پوری ہو گئیں، اب اگر
اُن نظام الدین کو جو علماء فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں نویں نمبر پر ہیں، وہ نظام الدین مانا
جاتا ہے جو دو سو سال میں محض تین پیڑھیاں گزارنے والے اور سکندر لودھی کے معاصر ہیں تو ان کی
اولاد میں ملا محمد حافظ (ورقۂ نسب میں پانچویں نمبر پر)، کو اکبر کا معاصر ماننا تاریخی طور پر خلاف
قیاس اس لیے قرار پائے گا کہ محض نصف صدی کے اندر ان ملا حافظ کی چار پیڑھیاں کیسے بیت گئیں،
جب کہ ان چار پیڑھیوں سے اوپر کی تین پیڑھیوں کے بیتنے میں دو سو برس صرف ہو گئے تھے ——
اور ملا محمد حافظ کا مغل بادشاہ اکبر کا ہم عصر ہونا، دستاویزی ثبوت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ ملا محمد حافظ
کی عمر عہد اکبری کی ابتدا میں پچاس پچپن برس اگر قرار دی جائے —— جب کہ قرائن کا تقاضا
اس سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے —— تو ملا محمد حافظ خود سکندر لودھی کے معاصر نظر آتے ہیں یعنی
اپنے دادا کے بھی دادا کے معاصر ہو جاتے ہیں۔

یہ سراسر خلافِ قیاس نتیجہ صرف اس لیے نکلتا ہے کہ "چشتیہ بہشتیہ" میں مذکور برناوی علاء الدین
اور انکے بیٹے نظام الدین کو سہالوی علاء الدین اور ان کے بیٹے نظام الدین میں ناموں کے اشتراک
کی وجہ سے خلط ملط کر دیا گیا۔

رضی الدین محمود فتح پوری نے اغصان الانساب (فارسی مخطوط)، میں علاء الدین کے
بارے میں جو کچھ روایت کیا ہے وہ اور زیادہ محل تعجب ہے۔

ان کی تحریر کے مطابق علاء الدین "چار بھائیوں سمیت چنگیز خاں کے زمانے میں اس کی سفاکی اور خوں ریزی سے فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے وطن ہرات سے ہندستان آگئے۔ اور یہ سلطان غیاث الدین تغلق کا زمانہ تھا۔ اور یہ عہد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا تھا، علاء الدین اور ان کے ایک حقیقی بھائی مسعود متبحر عالم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلہ میں مسئلہ سماع پر علمائے دہلی حرمتِ سماع کے فتوے پر دستخط اور مہریں کر رہے تھے، نو وارد علاء الدین اور مسعود سے بھی حرمتِ سماع اور اس "حرام" پر اصرار کرنے والے کو واجب القتل قرار دینے پر دستخط چاہے گئے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے نو وارد و مسافر ہونے کا عذر پیش کر کے کسی طرح محضر پر دستخط کرنے سے نجات حاصل کر لی، اس صورت حال کی اطلاع حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے گوش گزار ہو گئی، جب یہ دونوں بھائی حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور اپنی زبان سے صورت حال بیان کی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خوش ہو کر علاء الدین کو نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ الی غیر النہایہ دعاے ترقی علم اور مسعود کو اسی طرح دعاے فراوانی دولت دنیا دی، بہرحال کچھ روز دلی میں بسر کرنے کے بعد ان چار بھائیوں میں دو پانی پت میں آباد ہو گئے، ان میں سے ایک بھائی صاحبِ اولاد ہوئے اور پانی پت کے تمام انصاری زادگان ان ہی کی اولاد ہیں، دوسرے بھائی لاولد فوت ہو گئے، بقیہ دو بھائیوں میں سے ایک نے قصبہ سنبھل میں اقامت اختیار کی اور سنبھل کے تمام انصاری زادے ان کی اولاد ہیں اور خود علاء الدین نے مشرق کی راہ اختیار کی اور بالآخر سہالی پہنچ کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔

"اغصان الانساب" کی روایت کا جو اور تفصیل سے وہاں بیان ہوئی ہے یہ خلاصہ ہے!

تاریخ کی کسوٹی پر یہ "روایت" کھری بھی اترتی ہے؟ چنگیز خاں کا ہرات پر حملہ جس کے نتیجے میں علاء الدین اور ان کے تین حقیقی بھائیوں نے وطن چھوڑا اور ہندوستان کا رخ کیا، ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء

میں ہوا تھا، ہندوستان میں اس وقت سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء تا ۶۳۳ھ / ۱۲۳۲ء) حکمراں تھا، اور یہ غیاث الدین تغلق کی سلطنت سے سو برس پہلے کی بات ہے، اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بدایوں میں ولادت بھی نہیں ہوئی تھی،

اگر ان علاء الدین اور ان کے تین حقیقی بھائیوں کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کسی طرح ہم عصر مان لیا جاتا ہے تو شجرۂ نسب کے تعلق سے ایک اور لاینحل سوال سامنے آجاتا ہے، علاء الدین جو بلاشک و شبہہ علمائے فرنگی محل کے اجداد میں ہیں ——— اس لیے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (م ۱۱۰۳ھ) نے بھی اپنی تحریروں میں اپنی نویں یا دسویں پیڑھی "کا جد" علاء الدین کو بتایا ہے ——— اگر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہمعصر تھے تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات ۷۲۵ھ سے ملا محمد حافظ کے نام شہنشاہ اکبر کے مہری فرمان کی تاریخ (۹۶۷ھ) تک دو سو بیالیس سال ہوتے ہیں اور ان دو سو بیالیس برسوں میں علاء الدین (درۃ نسب میں دسویں نمبر) کی تا ملا محمد حافظ صرف پانچ پشتیں ہوتی ہیں۔ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات اور حضرت شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کی وفات (۴۸۱ھ) کے درمیان جو دو سو چوالیس سال بیتے ان میں علاء الدین سے شیخ الاسلام تک پوری بیس پشتیں گزریں۔

تاریخی طور پر اس سے نتیجہ یہی نکالا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی عالم علاء الدین، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے معاصر تھے جن کے تین حقیقی بھائی اور تھے جن میں ایک کی اولاد پانی پت میں اور دوسرے کی اولاد سنبھل میں پائی جاتی ہے تو ہمیں کوئی وجہ انکار کی نہیں، لیکن یہ وہ علاء الدین نہیں ہو سکتے جن کی بعد کی پانچویں پشت میں ملا محمد حافظ شہنشاہ اکبر کے معاصر ہوئے ہیں اور جو درۃ نسب میں دسویں نمبر پر ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ علاء الدین برنادی جن کے بیٹے نظام الدین، سکندر لودھی کے معاصر تھے، اور وہ علاء الدین جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہمعصر مانے جاتے ہیں، اور جن کے بھائیوں کی

اولاد پانی پت اور سنبھل میں ہے، علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں مذکور علاء الدین (دسویں نمبر پر) سے جداگانہ شخصیتیں ہیں۔

اس سلسلے میں ضمناً یہ یاد کر لینا بھی مناسب ہوگا کہ پانی پت کے "دو ممتاز انصاری زادوں" ــــــ خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء) اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (م ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) کے شجرہائے نسب اس دوران میں سامنے آچکے ہیں، ان دونوں پانی پت کے انصاریوں کا جدی سلسلہ علمائے فرنگی محل کے جدی سلسلے سے نہ صرف جداگانہ ہے بلکہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی (م ۴۸۱ھ) سے پہلے کہیں ملتا نہیں ہے، قاری صاحب شیخ الاسلامؒ کے بیٹے خواجہ محمد انصاری کی اولاد میں ہیں[۱] جبکہ علمائے فرنگی محل شیخ الاسلام کے بیٹے جابر کی اولاد ہیں، اور قاری صاحب کے اجداد میں جو بزرگ سب سے پہلے ہرات سے ہندوستان آئے، وہ خواجہ ملک انصاری ہیں جن کی ہندوستان میں آمد کا زمانہ بھی صراحۃً بتا دیا گیا ہے۔ یعنی ۶۷۵ھ/۱۲۷۶ء، جب غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ/۱۲۶۶ء تا ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء) دہلی کے تخت سلطنت پر تھا[۲]۔ مولانا حالی کے شجرۂ نسب میں بھی خواجہ ملک علی انصاری آتے ہیں[۳]۔ اس طرح قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا حالی پانی پتی ہم نسب ہوئے علمائے فرنگی محل کے ہم نسب کہیں سے نہیں ہوئے۔ اغصان الانساب کے مصنف نے علاء الدین اور ان کے تین بھائیوں کی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی معاصرت پر مبنی جو روایت بیان کی ہے، وہ "شنیدم" (میرے سننے میں آیا ہے) سے شروع کی ہے، جو "تحقیق" کے حدود کے اندر نہیں آتی۔ "تذکرہ علمائے فرنگی محل" کے مصنف نے "اغصان الانساب" کی یہ روایت بعینہٖ نقل کر دی ہے،[۴] مگر دعائے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے جز کو مشکوک قرار دیا ہے۔[۵] جس بنیاد پر اس جز کو مشکوک قرار دیا ہے

۱ تذکرۂ رحمانیہ مطبوعہ (محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۶ء) ۲ حوالہ بالا۔ ۳ رسالہ جامعہ دہلی ۲۴ شمارہ ۱۰، ۱۹۳۵ء ۴ تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۸ ۵ حوالہ بالا۔

اسی بنیاد پر سہالی، سنبھل، اور پانی پت کے انصاری زادگان کے ہم نسب ہونے کی کہانی بھی بے بنیاد قرار پا جاتی ہے۔

مصنف قرۃ الابصار لکھتے ہیں:

"نصیر اور مسعود جو پانی پت کے ہیں جداگانہ نسب نامہ رکھتے ہیں اور سنبھل کے انصاری زادگان اس سے مختلف نسب نامہ رکھتے ہیں۔ اور ہمارے جد، علاء الدین کا شجرۂ نسب دوسرا ہے۔ یہ سب (سہالی، پانی پت، اور سنبھل کے انصاری زادگان) ایک باپ کی نسل سے ہو ہی نہیں سکتے، مسعود پانی پتی کی اولاد میں دولت دنیا کی دعا کا جو اثر پایا جاتا ہے وہ شاہ بو علی قلندرؒ پانی پتی کی دعا تھی، جیسا کہ مسعود پانی پتی کی اولاد سے سننے میں آیا ہے، علاء الدین جو ہمارے جد ہیں ان کا شجرۂ نسب وہی ہے جو ہمارے پاس (ورقۂ نسب) ہے، ان علاء الدین کو برناوی کہنا بھی محض اٹکل پچو بات ہے۔ ۔۔۔۔ اگر کوئی کہے تو تمہارے جد علاء الدین کی قبر پھر کہاں ہے؟ تو میں جواب دوں گا، یہ مٹ چکی ہے۔" ویسے ہی جیسے شیخ محمد حافظ (معاصر شہنشاہ اکبر) اور ان کے بیٹوں کی قبروں کے نشان محو ہو چکے ہیں۔ میں نے بچشم خود ملا حافظ کی قبر کو جہاں انکے بیٹوں کی قبریں بھی تھیں، دیکھا تھا۔ مگر اب وہ ساری آراضی زیر کاشت ہے"[۱]

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر اس تفصیلی بحث سے مقصود "ان روایتوں" کی عدم صحت کو سامنے لانا ہے، جو علم الانساب سے ناواقفیت کے اس دور میں حقیقت اور صحت کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

خاندان فرنگی محل میں وہ کون بزرگ تھے جو سب سے پہلے ہندوستان آئے؟ اس کا صحت و ثبوت کے ساتھ بتانا اب ممکن نہیں البتہ اس خاندان کے اکابر کے ہندوستان میں مقامات قیام کے

۱ قرۃ الابصار (مخطوطہ فارسی)

بارے میں فرنگی محل کے نامور عالم، مصنف مورخ اور محقق مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحئیؒ (م ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) جن کی تحقیق خاندان فرنگی محل کے عمود نسب کے بارے میں اوپر مذکور ہو چکی (جو ورقۂ نسب کے مطابق ہے۔) اپنی تحقیق یوں بیان کرتے ہیں:۔

"ہمارے اجداد مدینہ منورہ سے ہرات، وہاں سے دہلی، وہاں سے سہالی ـــ جہاں پر ملا قطب الدین شہید کی قبر ہے ـــ وہاں سے لکھنؤ منتقل ہوئے[1]"

مولانا عبد الحئیؒ کی تحقیق میں ان کے اجداد کے "سرسل" "برناوا" "شیخوپورہ" اور "راپٹری" میں قیام کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "مقامات قیام" کے سلسلے میں مولانا نے پہلے لاہور کا بھی نام لیا تھا۔ اور جب قیام لاہور ان کی تحقیق کے خلاف ثابت ہوا تو انھوں نے اس کا ذکر حذف کر دیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی مذکورہ حوالے کی کتاب النافع الکبیر کے پہلے ایڈیشن میں جو مطبع مصطفائی سے نکلا تھا۔ قیام لاہور کا ذکر ملتا ہے لیکن ان کی حیات ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع دبدبۂ احمدی سے نکلا تو اس میں "قیام لاہور" کا ذکر متروک تھا۔

دبدبۂ احمدی ایڈیشن میں قیام لاہور کا ذکر نہ پاکر مصنف قرۃ الابصار نے لکھا ہے:۔

"میں نے دبدبۂ احمدی میں چھپنے والے ایڈیشن کا مسودہ دیکھا تو پایا کہ مصنف (مولانا عبد الحئیؒ) نے قیام لاہور کا ذکر قلم زد کر دیا تھا۔ سنا ہے کہ چونکہ ہمارے قبیلۂ انصار کا قیام لاہور ثابت نہیں ہوا، اس لیے اسے قلم زد کر دیا[2]"

قبیلۂ انصار کا سہالی میں قیام کب سے ہوا، اس خاندان کے بعض مورخوں نے ملا علاء الدین کو ورقۂ نسب میں عنہ اور بعض مورخوں نے ان کے بیٹے مولانا نظام الدین کو سہالی کا اولین باشندہ قرار دیا ہے۔ دونوں طرف کے مورخوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی کوئی

---

[1] النافع الکبیر (عربی مطبوعہ) از مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحئیؒ فرنگی محلی، [2] قرۃ الابصار (مخطوطہ فارسی)

سند نہیں بیان کی ہے۔ اس لیے اب اس کو موضوع بحث و تحقیق بنانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی ہے۔ اس سلسلے میں جو بات سند و ثبوت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ ورقۂ نسب میں پانچویں نمبر پہ مذکور ملا محمد حافظ، شہنشاہ اکبر کے عہد میں (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) تھے، نہ صرف تھے، بلکہ "مدرس" کے لقب سے مشہور بھی ہو چکے تھے، شہنشاہ اکبر نے اپنی تخت نشینی کے تین برس گزرنے کے بعد، ان کے نام اپنی مہر سے مدد معاش کا جو فرمان صادر کیا تھا اس میں علاوہ اور القاب و آداب کے مدرسین کے لقب کا بھی ذکر ہے۔

فرمان اکبر کی تفصیل میں جانے سے قبل شجرہ نسب ہی سے متعلق ایک اور روایت کا ذکر بھی ہو جانا چاہیے جس کے اولین راوی ملا عبد العلیٰ فرنگی محلی (م ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) ہیں۔

(باقی)

ابن الدمامینی اور اسکی شاعری

از۔ ڈاکٹر حامد علی خان صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شیخ بدرالدین محمد بن ابوبکر بن عمر ابن ابوبکر بن محمد ابن سلیمان بن جعفر بن یحییٰ ابن حسین ابن محمد بن احمد بن ابوبکر بن یوسف بن علی بن صالح ابن ابراہیم البدر القریشی المخزومی کی ولادت ۷۶۳ھ[1] میں مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں ہوئی، شیخ بدرالدین "ابن الدمامینی" کے نام سے مشہور ہیں، ان کا خاندان علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز تھا، ان کے جد امجد کے حقیقی بھائی "بہاء الدین عبداللہ بن ابوبکر الدمامینی" ایک بلند پایہ فاضل تھے، اور نانا "ناصر الدین بن المنیر" اپنے دور کے بے نظیر عالم اور اعلیٰ مصنف تھے، ان کی تصانیف میں سے "المقتفی، الانتصاف من الکشاف، الثلاثۃ من المأۃ الثامنۃ" کو بہت شہرت حاصل ہوئی،

ابن الدمامینی نے بہاء الدین عبداللہ دمامینی، عبدالوہاب قروی اور اپنے وطن کے دیگر فضلاے وقت سے کسب علم کیا، بعد ازاں قاہرہ گئے اور وہاں سراج الدین بن الملقن شوبری اور مجد الدین اسماعیل حنفی وغیرہ افاضل کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، آخر میں مکہ مکرمہ جا کر قاضی ابوالفضل نویری سے علمی استفادہ کیا، اور اپنی اعلیٰ ذہانت، فہم و فراست، عمدہ قوت حافظہ اور ذاتی جد و جہد کی وجہ سے عربی زبان کے فنون ادب یعنی نثر و نظم، صرف و

[1] ابن عماد نے سنہ ولادت ۷۶۲ھ لکھا ہے (شذرات الذہب ج ۷، ص ۱۸۱) لیکن یہ سہو کتابت یا مصنف کی فروگذاشت ہے کیونکہ ابن عماد کا ماخذ سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ ہے، جسمیں وہی سنہ ولادت درج ہے جو ہم نے تحریر کی۔

نحو اور لغت وغیرہ میں کامل مہارت حاصل کرلی تھی، اسی لیے "ابن الدمامینی" "مالکی نحوی ادیب" کے لقب سے شہرت پائی، ان کے معاصرین ان کے تفوق اور علمی فضیلت کے معترف تھے۔

حالات و واقعات زندگی

ابن الدمامینی نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسکندریہ کے چند مدرسوں میں یکے بعد دیگرے تدریس کی خدمت انجام دی، پھر محکمۂ قضا میں ابن التنیسی کے نائب مقرر ہوئے، اور کچھ عرصے تک اپنے وطن میں فرائض منصبی ادا کیے، جب ابن التنیسی قاہرہ گیے، تو یہ بھی ان کے ساتھ گیے، اور قاہرہ میں نیابت کی ذمہ داریوں سے بحسن اسلوب عہدہ برآ ہوئے، لیکن تعلیم کی طرف ذاتی میلان کی وجہ سے جامع ازہر میں پڑھانا شروع کردیا، ۸۰۰ھ میں اپنے چچازاد بھائی کے ہمراہ دمشق پہنچے، اور حجاز مقدس کا رخ کیا، حرمین شریفین میں حاضری کا شرف حاصل کیا، اور فریضۂ حج سے فراغت کے بعد اپنے وطن اسکندریہ کو مراجعت کی، اور عہدۂ نیابت سے سبکدوشی حاصل کرکے جامع اسکندریہ میں خطابت کا منصب قبول کیا، ساتھ ہی تجارتی کاروبار کی طرف توجہ کی، اور اعلیٰ پیمانے پر کام شروع کرنے کے لیے کئی لاکھ روپے کی رقم ادھار لے کر پارچہ بافی کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا، مگر بدقسمتی سے کارخانے میں آگ لگ گئی، اور وہ قرض خواہوں کے خوف سے بھاگ کر صعید چلے گیے، مگر قرضخواہوں نے تعاقب کیا، اور جب یہ ان کے ہاتھ لگے، تو وہ انھیں ذلیل و رسوا کرکے قاہرہ لے آئے، یہاں تقی الدین بن حجہ کی دستگیری کام آئی، اور ناصر الدین البارزی نے بڑی فراخ دلی سے مدد کی جس سے ان کی پریشانی بھی رفع ہوگئی اور مالی حالت بھی بہتر ہوگئی،

اس کے بعد وہ الملک المؤید کے دربار میں باریاب ہوئے، اور مالکی محکمۂ قضا میں ان کا تقرر کرلیا گیا، مگر مخالفوں نے چین نہ لینے دیا، اور ایسے بے بنیاد الزامات اور رکیک اعتراضات عائد کیے کہ بالآخر تنگ آکر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوگیے۔

فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد یمن تشریف لائے، اور تقریباً ایک برس تک جامع زبید میں درس دیا، مگر یہاں بھی حالات ناسازگار دیکھ کر سفرِ ہند کا عزم کیا، اور شعبان ۸۲۰ھ[1] کے آخر میں سلطان احمد بن محمد بن مظفر گجراتی کے عہدِ حکومت میں گجرات تشریف لائے۔

اہلِ ہند نے ابن الدمامینی کی پذیرائی اور واقعی قدردانی کی، اور ان سے علمی استفادہ بھی کیا، اس طرح یہاں کے قیام کے زمانہ میں یک گونہ فراغت نصیب ہوئی، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور شعبان ۸۲۷ھ[2] میں دکن کے شہر گلبرگہ میں انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی حاسد نے انہیں انگور میں زہر دے دیا تھا جس کے اثر سے وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکے[3]۔

ابن الدمامینی فنونِ ادب میں ماہر اور ایک بلند پایہ ادیب و شاعر تھے، ان کے ہمعصر ادیبوں نے ان کے فضل و کمال اور شعر و ادب میں بلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

ابن الدمامینی کے شاگردوں کی تعداد بے شمار تھی، ان کے سب سے مخلص، جان نثار اور اطاعت شعار شاگرد زین الدین عبادہ تھے، جو یمن میں قیام کے زمانہ تک برابر ان کے ساتھ رہے، مگر جب یہ ہندوستان تشریف لائے، تو دونوں میں جدائی ہو گئی، اس موقع پر مشفق استاذ نے بطور یادگار انہیں اپنا تحریر کردہ "حاشیہ المغنی" عطا کیا تھا۔

تصنیفات | ابن الدمامینی کا محبوب ترین مشغلہ تصنیف و تالیف تھا، جسے انھوں نے سفر و حضر

[1] تمام سوانح نگاروں نے ابن الدمامینی کے ہندوستان آنے کی یہی تاریخ لکھی ہے، خود مولانا سید عبدالحئی صاحب نے بھی نزہۃ الخواطر (جلد ۳ ص ۱۳۱) میں یہی لکھا ہے، مگر مولانا نے اپنی دوسری تصنیف "یاد ایام" میں لکھا ہے، کہ وہ ۸۰۰ھ میں وارد ہند ہوئے، جو غلط ہے۔ [2] بستان المحدثین ص ۱۳۲، کشف الظنون جلد ۱ ص ۵۴۹ و ص ۶۹۶، معجم المطبوعات جلد ۳ ص ۸۷۹، میں سنہ وفات ۸۲۸ھ

تعلیم و تدریس، قضا و خطابت اور تجارت وغیرہ سے وابستگی کے دور میں بھی جاری رکھا، اس لیے انھوں نے گوناگوں موضوعات پر کتابیں لکھیں، جو ان کی علمی فضیلت و عظمت کی آئینہ دار ہیں، مگر اربابِ تذکرہ نے انکی چند ہی کتابوں کے نام گنائے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) تاریخ الفرائد:۔ مصنف کا بیان ہے کہ ہندوستان کے سفر میں ابن مالک طائی کی تصنیف "التسہیل" ان کے ساتھ تھی، جس سے اہلِ ہند ناواقف تھے، بعض طلبہ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ اس کی شرح لکھوں، انہی کی درخواست کے پیشِ نظر میں نے یہ شرح لکھی، اس کے خطبہ میں شارح نے ابوالفضل احمد شاہ گجراتی کے حسنِ سلوک، اور احسانات کی تعریف و توصیف کی ہے۔

(۲) مصابیح الجامع شرح البخاری:۔ اس شرح میں اعراب اور نحوی مسائل بیان کیے گیے ہیں، اور یہ سلطان احمد شاہ گجراتی کے لیے لکھی گئی تھی۔

(۳) عین الحیاۃ:۔ یہ کتاب دمیری کی مشہور تصنیف "حیاۃ الحیوان الکبریٰ" کی تلخیص ہے جو شعبان ۸۲۳ھ میں مرتب ہوئی، اور مصنف نے سلطان احمد شاہ گجراتی کے پاس اسے ہدیۃً بھیجا۔

(۴ و ۵) تحفۃ الغریب فی شرح مغنی اللبیب لابن ہشام النحوی:۔ ابن الدمامینی نے "مغنی اللبیب" کا پہلا حاشیہ یمن میں لکھا، اور اپنے تلمیذ رشید زین الدین عبادہ کو مرحمت فرمایا، دوسرا حاشیہ ہندوستانی طلبہ کی خاطر ہندوستان میں لکھا، اس میں ابن ہشام نحوی کی کتاب کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا، اور مفصل گرفت کی ہے، التقی الشمنی نے اس کے جواب میں ابن الدمامینی پر نقد

بقیہ حاشیہ (ص ۱۳۸) مرقوم ہے، علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ (ج ۱ ص ۲۳۱) میں ۸۲۷ھ لکھا ہے، مگر وہ اپنی دوسری تصنیف بغیۃ الوعاۃ ص ۳۴ میں اس پر شک و تردد ظاہر کرتے ہیں، اور اسکے بجائے ۸۳۷ھ یا ۸۳۸ھ وفات کا سال بتاتے ہیں۔ [3] شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین ص ۱۳۲ میں اس روایت کی یہ حقیقت بتائی ہے کہ انکی موت اچانک ہوئی تھی اور وہ پہلے سے بیمار نہ تھے، اس لیے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ انہیں زہر دے دیا گیا ہے۔

وتعقب کیا تھا، مگر ان کے تلامذہ نے ان کے خیالات کی ہنوائی اور اپنے استاذ کی حمایت کی ہے، اور معترضین کی نکتہ چینی کے جوابات دیے ہیں،

(۶) جواہر البحور فی العروض:۔ علم عروض کی تشریح میں یہ کتاب لکھی گئی ہے،

(۷) العیون الفاخرۃ الغامزۃ علی خبایا الرامزۃ:۔ یہ کتاب "الخزرجیہ" کی شرح ہے،

(۸) نزول الغیث الذی انسجم فی شرح لامیۃ العجم:۔ ابن الدمامینی نے علامہ صلاح الدین صفدی کی تالیف "شرح لامیۃ العجم" کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے اغلاط کی نشاندہی کی ہے، یہ کتاب اہل علم کے لیے ایک بہترین تحفہ اور قیمتی سرمایہ ہے،

(۹) الفواکہ البدریہ:۔ ابن ناہض نے "الملک المؤید" کے سوانح حیات کتابی شکل میں لکھے تھے، ابن الدمامینی نے "سیرۃ المؤید لابن الناہض" کو نظم کا جامہ پہنایا، اور اسے "الفواکہ البدریہ" کے نام سے موسوم کیا،

(۱۰) مقاطع الشرب:۔ ابن الدمامینی کی نظموں کا ایک مجموعہ ہے،

(۱۱) الفتح الربانی:۔ علم حدیث میں ایک تالیف ہے،

(۱۲) اظہار التعلیل المغلق:۔ اس میں ایک پیچیدہ نحوی مسئلے کو بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے،

(۱۳) شمس المغرب فی المرقص والمطرب:۔ ابن الدمامینی کی یہ کتاب فن ادب میں ہے،

مذکورۂ بالا کتابوں میں سے صرف دو[2] کتابیں "تحفۃ الغریب" اور "العیون الفاخرہ" ہی حلیۂ طباعت سے آراستہ ہوئیں، اور سب ابھی تک مخطوطہ ہیں،

شاعری ابن الدمامینی ایک قادر الکلام، پرگو اور زود گو شاعر تھے، ان کا کلام شعری محاسن کا حامل اور نقائص سے خالی ہے، اس میں جزالت، پختگی، انسجام، روانی اور تنوع ہے،

مگر کلام کے متفرق ومنتشر حالت میں ہونے، اور کسی مجموعہ میں مرتب دیکھا نہ کیے جانے کی بنا پر اشعار کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ہم کو جس قدر (۳۷) اشعار دستیاب ہوئے ہیں انہیں مع ترجمہ نقل کرتے ہیں، اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ کلام محفوظ ہو جائے گا۔

ابن الدمامینی کے قرض خواہوں میں الحافظی نامی شخص پیش پیش تھا جس نے ان کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، یہاں تک کہ اس نے "الملک المؤید" سے بھی ان کی شکایت کی تھی، اسی کے پیش نظر ابن الدمامینی نے مؤید کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہا تھا، جس کے تین شعر یہ ہیں:

أیا ملك العصر ومن جوده   فرض علی الصامت واللافظ[1]

"اے شاہ زمانہ اور اے وہ ذات گرامی جس کی سخاوت خاموش وگویا دونوں پر یکساں طور پر لازم وفرض ہے، یعنی تیرے دریائے فیض سے انسان وحیوان سب ہی سیراب ہوتے ہیں"

أشکو إلیك الحافظ المعتدی   بکل لفظ فی الدجی غائظ

"میں آپ کے پاس حافظ کی شکایت لے کر حاضر ہوا ہوں، جو غیظ وغضب کے ہر قسم کے الفاظ استعمال کرکے میرے اوپر ظلم کر رہا ہے"

وما عسی أشکو وأنت الذی   صح لك البغی من الحافظ

"میرے لیے شکایت کرنا ممکن نہ تھا، مگر آپ ہی ایسے مرتبے کے حامل ہیں، جس کے لیے حافظ کی دراز دستی سے نپٹنا صحیح ہوگا"

دو اور[2] شعر ملاحظہ ہوں:

رمانی زمانی بما ساءنی   فجاءت نحوس وغابت سعود[2]

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، [2] ایضاً

"زمانے نے اپنے مکروہات کے تیر مجھ پر برسائے، اس لیے میں ہر قسم کی نحوست وبدنصیبی سے دوچار ہوں، اور خوش قسمتی مجھ سے کافور ہو گئی ہے۔"

واصبحت بین الوری بالمشیب — علیلا فلیت الشباب یعود

"میں مخلوق کے درمیان بڑھاپے کی وجہ سے بیمار انسان کی مانند ہو گیا ہوں، کاش جوانی لوٹ آتی، اور مسرت بخش زندگی نصیب ہوتی۔"

محبت والفت کے باقی رہنے اور فراق کی مذمت کے بارے میں:

قلت له والدجی مول — ونحن بالانس فی التلاقی[1]

"میں نے محبوب سے اس وقت درخواست کی جبکہ رات کی تاریکیاں چھٹنا شروع ہوئیں، درانحالیکہ ہم انسیت کے ساتھ باہم محو ملاقات تھے۔"

قد عطس الصبح یا حبیبی! — فلا تشمته بالفراق

"اے میرے محبوب! پو پھٹ چکی ہے، اس لیے تو عاشق کو فراق کے ذریعہ محروم کرکے مسرور نہ ہو۔"

ناصح کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:

یا عذولی فی مغن مطرب — حرک الاوتار لما سفرا[2]

"اے میرے ملامت گر! ایسے نشاط انگیز موسیقار کے سلسلہ میں جس نے صبح کے وقت سرود کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔"

کم یهز العطف منه طربا — عند ما تسمع منه وتری

"اگر تو اس کا نغمہ سنے اور اس کا رخ روشن دیکھے تو تجھے بھی یقین ہو جائے گا کہ بیشمار قلوب میں اس کی وجہ سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔"

۱؎ الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، ۲؎ ایضاً۔

بدا وکان قد اختفی من مراقبه — فقلت: هذا قاتلی بعینه وحاجبه[1]

"محبوب اپنے محافظ سے مخفی ہو کر جب میرے سامنے جلوہ گر ہوا، تو میں نے اس سے کہا: یہی وہ ذات ہے جو اپنے چشم وابرو سے قتل کرنے والی ہے۔"

لاما عذاریک هما اوقعا — قلب المحب الصب فی الحین[2]

"اے محبوب! یہ تمہارے گیسوؤں کے دو لام ہیں، جنہوں نے غمزدہ عاشق کے دل کو موت کے کرب والم میں مبتلا کیا ہے۔"

فجد له بالوصل واسمح به — فغیک قد هام بلا مین

"پس تو ایسے عاشق کو وصل سے سرفراز کر، کیونکہ وہ تیری ہی وجہ سے بلاشبہ پاگلوں کی طرح آوارہ پھر رہا ہے۔"

حسین اور بزدل عورت کے بارے میں کہتے ہیں:

مذ تعانت صناعة الجبن خود — قتلتنا عیونها الفتانة[3]

"جب سے کہ نازک بدن نوجوان عورتوں نے پُرتکلف بزدلی کے طریقہ کو اپنایا ہے، تو انکی فتنہ انگیز آنکھوں نے ہمیں قتل کر ڈالا ہے۔"

لو تقل لی کم مات فیها قتیل — کم قتیل بهذه الجبانه

"مجھے کشتگانِ عشق کا علم ہے، اس لیے مجھے نہ بتاؤ کہ ان کی وجہ سے کتنے لوگ مقتول ہو گئے"

۱؎ الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، ۲؎ ایضاً، بستان المحدثین: ۲۶۶ میں یہ شعر اس طرح درج کیا گیا ہے:

الا یا عذاریکه هما اوقعا — قلب المغنی الصب فی الحین

ترجمہ: "آگاہ ہو! یہ تمہارے گیسو ہی ہیں جنہوں نے مصیبت زدہ عاشق کے دل کو موت کے رنج والم میں مبتلا کیا ہے۔"

۳؎ بغیة الوعاة: ۲۸۔

ہیں، اور اس بزدل عورت کے ہاتھوں بہت سے قتل ہو چکے ہیں۔"

قم بنا نرکب طرف اللهو سبقا للمدام
وانثن یا صاح عنانی للکمیت وللجام[1]

"(۱) اے معشوق! ہمارے ساتھ چل تاکہ ہم شراب نوشی میں سبقت کرتے ہوئے لہو ولعب میں منہمک ہو جائیں، (۲) اور اے میرے ساتھی! میرا رخ سرخ وسیاہ رنگ کی پرانی شراب اور جام کی طرف پھیر دے۔"

الله اکبر یا محراب طرّته کم ذا تصلی بنار الحرب من صاب[2]

"معشوق کی پیشانی کے بالوں کی محراب کا حسن تعریف سے بالاتر ہے، اے محبوب! تو کسی مشتاق کو جنگ کی آگ میں کتنا بھونے گا۔"

وکم اقمت باحشائی حروب هوی منک قلبی مفتون بمحراب

"تم نے میرے قلب وجگر میں عشق کے بہت سے نیزے پیوست کر دیے، لہذا تمہاری وجہ سے ہی میرا دل (تم جیسے) جنگجو کا دیوانہ ہو چکا ہے۔"

ناصر الدین بن التنیسی نے ابن الدمامینی کو حاکموں سے حلف وفاداری لینے کی ذمہ داری عطا کی تو انہوں نے کہا:

یا حاکما لیس یلفی نظیره فی الوجود[3]

قد زدتنی فی الفضل حتی قلدتنی بالعقود

"(۱) اے حاکم! جس کی نظیر عالم وجود میں نہیں پائی جاتی، (۲) آپ نے میری عظمت وفضیلت میں اضافہ فرمایا، یہاں تک کہ آپ نے حکام سے وفاداری کا حلف لینے کی ذمہ داری میرے سپرد کی۔"

۱ الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، ۲ ایضاً، ۳ ایضاً۔

برہان المحلی التاجری کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

یا سیدا معروفه لیس یحصی ورئیسا ذکا بفرع واصل[1]

"اے سردار جس کے احسانات حد شمار سے باہر ہیں، اور اے رئیس جو اپنی اصل وفرع دونوں کے اعتبار سے پاکیزہ ہے۔"

من علا فی الوری محلک عنا قلت هذا هو العزیز المحلی

"جب سے کہ آپ کا مرتبہ و درجہ عزت کے اعتبار سے مخلوق میں بلند ہوا ہے، تو میں نے کہا: یہی محلی شریف، نادر اور غالب بادشاہ ہے۔"

شہاب فاروقی کی مدح کے دو شعر یہ ہیں:

قل للذی اضحی یعظم حاتما ویقول لیس لجوده من لاحق[2]

"جو شخص کہ حاتم طائی کو بہت بڑا سمجھتا ہے، اور اس بات کا قائل ہے کہ اس کی سخاوت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، تو اس سے کہو:"

ان قسته بسماح اهل زماننا اخطأ قیاسک مع وجود الفارق

"اگر تو نے شہاب فاروقی کا قیاس ہمارے اہل زمانہ کی سخاوت کے معیار پر کیا، تو تیری قیاس آرائی بالکل غلط ہوگی، کیونکہ ممدوح اور دیگر انسانوں کے درمیان عظیم تفاوت ہے، اس لیے اس کو ان پر قیاس کرنا باطل ومحال ہے۔"

ہرن کو چیستاں کے طریقے پر تحریر کیا ہے:

ان من قد هویته محنتی فی وقوفه[3]

"بے شک میں جس پر فریفتہ ہوا ہوں تو میری آزمائش اس کے ٹھہرے رہنے میں ہے۔"

۱ الضوء اللامع ۷: ۱۸۷، ۲ ایضاً، ۳ شذرات الذهب ۷: ۱۸۲۔

فاذا زال ربعه   زال باقی حروفه

"کیونکہ جب اس کا محلہ ویران ہو جائے، تو اس کے تمام اطراف بھی ویران ہو جاتے ہیں، یعنی جس طرح چراگاہ کی گھاس ہر طرف سے ختم ہونے کے بعد باعثِ کشش نہیں رہتی، اسی طرح ہرن جیسے معشوق کی جوانی ڈھلنے کے بعد اس کے تمام محاسن ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں"

ملک مصر کی تعریف کے دو شعر درج ہیں:

رعی اللہ مصرا اننا فی ظلالها   نروح ونغدو سالمین من الکلل[1]

"خدا ملک مصر کو محفوظ رکھے، ہم اپنے ملک کے زیر سایہ ہر ایک رنج سے عافیت میں رہ کر صبح و شام کرتے، یعنی زندگی بسر کرتے ہیں۔"

ونشرب ماء النیل منها براحة   واهل زبید یشربون من الکلل

"ہم اپنے ملک میں نہایت آرام سے دریائے نیل کا پانی پیتے ہیں، جبکہ زبید کے لوگوں کو مشقت کے بعد ہی پانی نصیب ہوتا ہے۔"

زبید اور اہل زبید کی ہجو کے مزید دو شعر ملاحظہ ہوں:

قالت وقد فتحت عیونا نعسا   ترمی الوری بالجور فی الاحکام[2]

"محبوبہ نے ایسی اونگھتی ہوئی آنکھوں کو کھولا، جو اپنے فیصلوں سے مخلوق پر ظلم و ستم کے تیر برسا رہی تھیں، اور یہ کہا کہ:"

احذر هلالك فی زبید فاننی   لذوی الغرام فتحت باب سهامی

"زبید میں ہلال (نیا چاند) دیکھنے سے پرہیز کر کیونکہ میں نے گرفتارانِ عشق کے لیے اپنے تیروں کا دروازہ کھول دیا ہے۔"

---

[1] نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر ۳: ۱۳۰، [2] ایضاً۔

ہندستانی علماء سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایا علماء الهند انی سائل   فمنوا بتحقیق به یظهر السر[1]

"اے ہندستان کے علماء و فضلاء! میں آپ حضرات سے ایک سوال کر رہا ہوں، بس آپ لوگ اس سوال کا ایسا جواب دیکر مجھے ممنون بنایئے، جس سے راز سربستہ واضح ہو جائے۔"

فما فاعل قد جر بالخفض لفظه   صریحا ولا حرف یکون به الجر

"وہ کون سا فاعل ہے، جس کو رفع کے بجائے صراحت کے ساتھ لفظاً زیر دیا گیا ہو، حالانکہ وہاں کوئی ایسا حرف نہیں ہے، جس کی وجہ سے زیر دیا جائے۔"

ولیس بذی جر ولا بمجاور   لذی الخفض والانسان للجهل یضطر

"نہ تو فاعل کے پہلے حرف جار ہے، اور نہ وہ مجرور سے متصل ہے، اور انسان مجبور ہو کر ہی غلطی کا مرتکب ہوا کرتا ہے۔"

فمنوا بتحقیق به استفیده[2]   فمن بحرکم ما زال یستخرج الدر

"اس سوال کا تحقیقی جواب مرحمت فرما کر احسان کیجئے، میں اس سے استفادہ کروں گا، کیونکہ آپ کے سمندر سے سدا موتی نکالے جاتے رہے ہیں، یعنی آپ حضرات کے علم و فضل سے برابر فائدہ حاصل کیا جاتا رہا ہے، اور آپ لوگ ہمیشہ علمی گتھیاں سلجھاتے رہے ہیں۔"

طرفہ بن العبد البکری عہد جاہلیت کا نامور شاعر ہے، جو اصحاب معلقات میں بھی شمار کیا جاتا ہے، ابن الدمامینی کا اشارہ اسی کے رائیہ قصیدے کے حسب ذیل شعر کی طرف تھا جس میں راء مکسور ہے، حالانکہ فعل "هاج" کا "صنبر" فاعل ہے، اور فاعل مرفوع ہوا کرتا ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر ۳: ۱۳۰ [2] یہ مصرع اس طرح بھی منقول ہے، ع فهل من جواب عندکم استفیده؟ یعنی کیا آپ حضرات کے پاس اس کا کوئی جواب ہے، جس سے میں مستفید ہو سکوں۔

بجفان، تعتري نادينا　　　من سديف حين هاج الصنبر[1]

شاعر اپنے قبیلے کے مفاخر بیان کرتے ہوئے کہہ رہا ہے، کہ جب سردی شدید ہو جائے اور عام طور سے لوگ پریشانی و بدحالی میں مبتلا ہو جائیں، تو ہمارے قبیلے کے لوگ ان کو مدعو کرتے ہیں اور نہایت فراخ دلی سے مہمان نوازی کرتے ہیں۔"

طرفہ کا یہ قصیدہ چھہتر ۷۶ اشعار پر مشتمل ہے، راقم نے مکمل قصیدہ پڑھنے کے بعد یہ ناقص رائے قائم کی ہے، کہ اگر قافیہ "راء" کو اعراب دیا جائے تو زیادہ تر اشعار میں "راء" کو زیر دیا جانا ضروری ہے، مگر قافیہ "راء" ساکن ہے، اس لیے مرفوع اور مجرور دونوں بہ حالت سکون صحیح ہیں، یہی جواب دیگر اشعار مثلاً "جنونٌ مُستعر، ینتقِر، ما نفر، تنبهر، تمُرّ" وغیرہ کے قوافی میں بھی دیا جائے گا، کہ ان سب میں "راء" یقیناً مضموم ہے، مگر ساکن ہونے کی صورت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ابن الدمامینی نے "کادی"[2] کے بارے میں بطور چیستاں کہا

وما شيء له نشر ذكي　　　لعاطره الى الطيب انتساب

"وہ کیا چیز ہے جس میں مشک کی سی مہک ہے، اور جس کے استعمال کرنے والے کو خوشبو سے نسبت ہے، یعنی اس کا شمار خوشبو استعمال کرنے والوں میں ہوگا۔"

تراوح له على رجليك تمشي　　　وتقلبه يداك فما الجواب

وہ تیرے پاؤں پر چل کر آتی ہے، اور تیرے ہاتھ اس کو چھنتے ہیں، بتاؤ اس

---

[1] دیوان طرفۃ بن العبد بہ تحقیق کرم البستانی (دار صادر، دار بیروت ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء): ۵۶، [2] علامہ سیوطی نے "بغیۃ الوعاۃ" ۲: میں اس چیستاں کے دو شعر اور اس کے جواب میں دو شعر نقل کیے ہیں، لیکن یہ چیستاں کوشش کے باوجود حل نہیں ہو سکی، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ چیستاں کا جواب بھی چیستاں ہی ہے۔

چیستاں کا کیا جواب ہے؟"

ابن الدمامینی کا بیان ہے کہ اسکندریہ کے سفر میں جب میں اس کے حدود میں داخل ہوا، اور مذکورہ بالا دونوں شعر پڑھے، تو ان کا جواب بھی برجستہ بصورت نظم یہ کہدیا:

ومذ سمعت بهذا اللغز أذني　　　اتاني من تفضله الجواب

"جب میرے کان نے اس چیستاں کو سنا تو اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے مجھے اس کا جواب معلوم ہوگیا۔"

فذا الطيب اذا صحفت منه　　　اخيريه له في الخبث باب

"بس وہ خوشبو ہے، جب تم اس کے آخری دو حرفوں میں تقدیم و تاخیر کی غلطی کردو تو اس سے خبیث چیز سمجھی جائے گی۔"

وفیات

پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم

از عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی رفیق دار المصنفین

گزشتہ سال کے آخر میں اردو دنیا کو جس حادثہ و فاجعہ سے دو چار ہونا پڑا وہ مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال پُر ملال ہے، ان کی شخصیت ایک جلوۂ صد رنگ تھی، وہ پروفیسر بھی رہے اور ایڈمنسٹریٹر بھی، ناقد بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی، محقق بھی تھے، اور شاعر بھی، اور ان سب بلند ایک شریف انسان بھی۔

ان کی شخصیت میں جہاں گوناگوں صلاحیتیں جمع ہو گئی تھیں وہاں وہ بڑی متنازعہ فیہ بھی رہی، ان کی رایوں سے اختلاف بھی ہوا اور اتفاق بھی، اردو شعر و ادب کے ایوان میں ان کی آواز سب سے جداگانہ اور منفرد تھی، ان کی تحریریں کچھ ایسی انتہا پسندانہ اور سخت تھیں کہ ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض ہو گیا، مگر ان کی رایوں سے اختلاف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے قلم سے اردو کے سرمایہ میں اضافہ ہوا۔ اور تاریخ ادب اردو میں اپنا ایک خاص مقام بنا گئے، جس کی وجہ وہ کبھی فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

کلیم الدین احمد ۱۹۰۸ء میں پٹنہ کے ایک علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی و فارسی کے فاضل اور پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ ان کے پرنانا حکیم عبدالحمید پریشاں نہ صرف اعلیٰ درجہ کے طبیب، علامۂ وقت بلکہ اردو، فارسی، عربی کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر تھے، یہ حکیم عبدالحمید وہ بزرگ تھے، جن کے والد مولانا احمد اللہ صادقپوری ممتاز اہلحدیث عالم اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ تھے، مجاہدین کے خلاف جو مقدمہ

قائم ہوا، اس میں انھیں بھی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی، اور جزیرۂ انڈمان میں انھوں نے وفات پائی، ان کی ساری جائداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔

کلیم الدین احمد بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے، اور اسی شوق نے ان کو تنہائی پسند اور گوشہ نشین بنا دیا تھا ان میں ذہانت خداداد بھی اور وہ خود نہایت محنتی طالب علم بھی رہے، بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے دونوں میں فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی، جس کی وجہ سے ان کو اعلیٰ تعلیم کیلئے سرکاری وظیفہ ملا، اور تعلیم کیلئے انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسی سے انھوں نے انگریزی ادب اور فرانسیسی زبان و ادب میں اعزاز حاصل کیا، ۱۹۳۳ء میں انگلستان سے واپسی پر پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اپنے عمدہ اوصاف محنت اور اعلیٰ قابلیت سے اپنے شعبہ میں سارے اعلیٰ مدارج طے کر لئے اور شعبۂ انگریزی کے صدر بھی ہوئے۔ اپنی علمی و تعلیمی دلچسپی کی وجہ سے بہار سکنڈری اگزامینیشن بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کی تشکیل کے بعد فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے، پھر پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے، کچھ دنوں بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، اور آخر میں حکومت بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن یعنی ناظمِ تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہو کر سبکدوش ہوئے، وہ جس عہدے پر بھی رہے اُن کے کاموں کا ریکارڈ قابلِ قدر اور شاندار رہا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کی معاملہ فہمی، منصف مزاجی اور دوسروں پر اعتماد کرنے کی عادت تھی، وہ دوسروں کے تجربے، محنت اور ایمانداری کی قدر کرتے اور ان کی عمدہ کارکردگی کی جی کھول کر حوصلہ افزائی کرتے، ہر معاملے میں بے لاگ اور غیر جانبدار طرز عمل اختیار کرتے، زبان سے کم بولنے کے باوجود ترقی کے تمام منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہناتے، اپنی علمی صلاحیت، پڑھانے کی استعداد، ہوشمندانہ طرز عمل اور قوتِ تحریر سے طلبہ اور پروفیسروں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کی بڑی خوبی تھی انتھک محنت اور مسلسل گھنٹوں کام کرنا۔ وہ پڑھے لکھے بے روزگار

لوگوں کی مدد کیلئے ہمیشہ تیار رہتے اور انھیں اخلاقی مدد پہنچاتے، وہ نیک، شریف اور بامروت انسان تھے، ان کی ان خوبیوں کے ان کے مخالف بھی معترف تھے، اور اس کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے۔

ان کی دلچسپی زیادہ تر مغربی ادبیات سے رہی، وہ انگریزی زبان میں بھی لکھتے تھے، ایک کتاب انگریزی میں بھی ہے۔ وہ اردو کی دنیا میں اچانک وارد ہوئے، جس سے ہلچل مچ گئی، ۱۹۳۱ء میں اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کرکے ایک مجموعہ "نغمۂ گل" کے نام سے شائع کیا، ۱۹۴۰ء میں جدید اصول تنقید کے مطابق "اردو شاعری پر ایک نظر" کے نام سے اپنی کتاب شائع کی، جس سے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس کتاب میں انھوں نے مغرب کی عینک سے اردو شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی اور مغربی اصولِ تنقید کے معیار پر مشرقی ادب کو جانچنے کی سعی فرمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور ان کی کتاب بھی ہدفِ ملامت بن گئی۔ ۱۹۴۱ء میں دائرۂ ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی اور رسالہ "معاصر" جاری کیا۔ دائرہ کے صدر اور رسالہ کے ایڈیٹر ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد بنائے گئے۔ کلیم الدین مرحوم معاصر کے لیے مسلسل مضامین لکھتے رہے، سترہ اٹھارہ سال میں انھوں نے جو مضامین لکھے، ان ہی کے مجموعے، "اردو تنقید پر ایک نظر" "سخنہائے گفتنی" "عملی تنقید" اور "فن داستان گوئی" وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے انھوں نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی، ان کا تحقیقی شوق اتنا بڑھا کہ اردو کے تقریباً سارے مطبوعہ تذکرے جمع کر لئے اور غیر مطبوعہ کی نقلیں حاصل کر لیں۔ انھوں نے پٹنہ کالج لائبریری میں مخطوطات و نایاب کتابوں کا شعبہ قائم کیا۔ تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشقی، دیوانِ جہان، تذکرۂ عمدۂ منتخبہ، تذکرۂ عیار الشعراء، اور مجمع الانتخاب خود اپنے ہاتھ سے نقل کئے، ان میں بعض شائع بھی ہو گئے، وہ شاعر بھی تھے، اور ان کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے کمالات کے ساتھ اس کی کمزوریوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے، یہ بات بڑی حد تک پروفیسر کلیم الدین احمد کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے ان کی تصانیف اور مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض جگہ نہ اردو شاعری کے ساتھ انصاف کر سکے ہیں اور نہ اردو کے تنقیدی سرمایہ سے۔ وہ بلاشبہ کثیر المطالعہ اور بڑے باصلاحیت انسان تھے، لیکن غلو، انتہا پسندی اور عدم توازن نے ان کی کتابوں کے وزن کو کم کر دیا ہے۔ وہ جہاں تنقید کے گہرے مسائل سے بحث کرتے ہیں اور حسن و قبح کے اعلیٰ معیار کو سامنے رکھتے ہیں، وہاں مشرق کے مزاج، ماحول، فضا اور اس کے تدریجی تسلسل کو نظر انداز کر جاتے ہیں، ان پر مغربی ادب کا رعب اس قدر طاری ہے کہ اسی معیار پر مشرقی ادب کو بھی جانچنے لگتے ہیں، جس کی وجہ سے مشرقی تہذیب، روایات، اور اس کی خصوصیات ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، ان کا یہ فیصلہ کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے، ان کے نزدیک میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ اس لئے اعلیٰ درجہ کے شاعر نہ تھے کہ وہ مغربی ادبیات سے واقف نہ تھے، اقبالؔ کی اعلیٰ درجہ کی نظمیں بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، انھوں نے "اردو شاعری پر تنقید" میں جس طرح اردو کے شعری کارناموں پر بحث کی ہے اس سے شعری سرمایہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں لکھا ہے کہ "اردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے، اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر ہے"۔ ان کا یہ خیال صحت سے بعید اور حقائق سے چشم پوشی ہے، انھیں اردو کے ہر دور کے ناقدوں میں یہی کمی نظر آتی ہے کہ وہ انگریزی ادب سے نا واقف تھے، انگریزی تنقید کے اصولوں کو سمجھنے سے قاصر تھے، اور اردو شاعری کے تجزیہ کیلئے اپنے مشرقی معیار سے باہر نہ جا سکے، ان کی نگاہ میں محمد حسین آزاد، حالیؔ، مولانا شبلیؔ اور

مولوی عبدالحق کوئی صحیح معنوں میں نقاد نہ تھا۔ ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا گیا، اور بڑی شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی گئی۔

ان کے متعلق ایک کتاب "حیات کلیم" شائع ہوئی تو معارف کے صفحات میں اس پر مکمل تنقید کی گئی، اس لئے ہم اس موقع پر مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر ان کی تنقیدوں میں توازن اور اعتدال ہوتا تو یقیناً بڑے اعلیٰ درجہ کے نقاد ہوتے اور نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے، بہرحال اپنی خامیوں کے باوجود انھوں نے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اور اردو کا حلقہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ انکی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

قاضی عبدالودودؒ

پروفیسر کلیم الدین احمد کے انتقال کے بعد اردو دنیا کو دوسرا بڑا صدمہ مشہور محقق قاضی عبدالودودؒ کی وفات سے پہنچا، قاضی صاحب نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میڈیکل کالج میں ۸۰ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ وہ بھی ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے، میرزاہد پر حاشیہ لکھنے والے ملا غلام یحییٰ بہاری آپ کے اجداد میں تھے، ملا غلام یحییٰ کے بیٹے قاضی کمال الحق شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے اور ناصر علی کے پیرو تھے۔ ان کے پوتے قاضی اکرام الحق حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدوں میں تھے، ان کے بھائی واعظ الحق ان علماء میں سے تھے، جو شورش کے زمانہ میں نظربند کئے گئے، قاضی سمعیل قاضی اکرام الحق کے بیٹے اور موزوں طبع شخص تھے جو اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے، ان کے بیٹے قاضی عبدالحمید قاضی عبدالودود کے دادا تھے اور والد قاضی عبدالوحید عالم دین تھے، مگر ان میں تبدیلی آئی اور عقائد میں بریلوی ہو گئے۔ اس لئے انھوں نے

اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ کے لیے ایک ماہانہ رسالہ "تحفہ" نکالا تھا، وہ شاعر بھی تھے، اور وحید الہ آبادی کی صحبت پائی تھی، ان کا اردو کلام گلدستوں میں ملتا ہے، انکی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔

قاضی عبدالودود ۱۸۹۶ء میں پٹنہ کے اندر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرانے طریقہ پر پائی۔ انگریزی شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر عربی صرف ونحو اور منطق میں متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد وہ پٹنہ کے محمڈن اسکول میں داخل ہوئے، اس اسکول میں سال ڈیڑھ سال رہنے کے بعد میجر سید حسن بلگرامی کے بلگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ گئے، وہاں ان میں کتب بینی کا شوق بڑھا۔ بے شمار کتابوں اور رسالوں کو پڑھا۔ پھر پٹنہ واپس آکر کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں بیٹھے، اسے پاس کر کے پٹنہ کالج میں داخل ہوئے۔ اور چار برس میں بی اے کر لیا۔ مگر انہی دنوں سیاسی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور تحریک خلافت سے وابستہ ہو گئے، اب تعلیم کا سلسلہ بند ہو گیا، اور کانگرس سے بھی تعلق پیدا ہو گیا، جس کے مختلف اجلاس میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے پھر کچھ دنوں کے بعد تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مارچ ۱۹۲۳ء میں انگلستان گئے، کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی بار ایٹ لا ہوئے لیکن غیر معمولی علمی دلچسپی کی بنا پر بیرسٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، قدرت کو منظور تھا کہ قانون اور اقتصادیات کے بجائے علمی و ادبی تحقیق کے میدان میں ان کا جوہر کمال چمکے، تمام عمر وہ اپنے طبعی رجحان کے مطابق کتب خانوں کی خاک چھانتے رہے انکا حافظہ اور قوت یادداشت غیر معمولی تھی، وہ اپنے بے مثال حافظہ کی بدولت تاریخ ادب کے ایسے ایسے حوالے دیتے تھے جو بہتوں کو برسوں کی تلاش و جستجو کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ ادب، عروض، قافیہ، تاریخ، تذکرہ اور ان سے متعلق مطبوعات اور مخطوطات سے گہری واقفیت تھی۔

وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن بھی جانتے تھے، لیکن

ان کو شغف اردو و فارسی ہی سے رہا، اور زندگی بھر اس کے نامعلوم گوشوں کی تلاش میں سرگرم عمل رہے، پچھلے پچاس برس کے اندر انھوں نے اردو کے دامن کو مالا مال کیا، اور ادبی تحقیق کے رہنوردوں کی تربیت کی۔

ان کی کتاب "عیارستان" اور "اشتر سوزن" ان کی علمی بصیرت اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، "دیوان جوشش" "دیوان رضا" "قطعات دلدار" کی تدوین میں انھوں نے جس محنت اور کاوش سے کام لیا ہے، اس سے ان کے تحقیقی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے "تذکرہ ابن طوفان" تنی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

انھوں نے غالب اور میر سے متعلق جو معلومات ان کی زندگی اور کلام کی صحت کے بارے میں بہم پہنچائی ہیں وہ ہمارے ادب کا قیمتی حصہ ہے، انھوں نے دراصل ادب کے ایسے گوشوں کو روشناس کرایا جو تحقیق کے مستحق تھے، "جہانِ غالب" ان کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ "آوارہ گرد اشعار" کے بارے میں بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں، قدیم شعراء کے بارے میں ان کی واقفیت بے نظیر تھی ان کے مضامین سے اردو کے مشہور مصنفوں کی غلطیوں کا پتہ چلا۔ "آب حیات کا تحقیقی جائزہ" "میر حیات و شاعری" "فائز دہلوی" "لکھنؤ کا دبستان شاعری" "عبدالحق بحیثیت محقق" اور "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" جیسے مضامین میں نکتہ چینی کے ساتھ بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں، صداقت و حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

وہ تحقیق کے سلسلے میں نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ اپنی رائے کے اظہار میں رو رعایت کی، ہر بات بے لاگ اور دو ٹوک طریقے پر کہنے کے عادی تھے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگ ان سے خوش نہ تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے آشنا کیا۔ انکی خوبی یہ تھی کہ وہ مقدمات اور نتائج میں ایک منطقی ربط و ترتیب تلاش کرتے اور جہاں انھیں یہ ربط

نہیں ملتا وہاں بے رحمی سے اس بے ربطی کو بے نقاب کر دیتے تھے، انکی تحریروں سے اردو تحقیق کے مبادیات، اصول، ضابطے اور طریق کار کے بارے میں بڑی رہنمائی ملتی ہے، جن سے تحقیقی کام کرنے والوں کو آئندہ بڑی مدد ملے گی، انھوں نے اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار ہی بلند نہیں کیا، بلکہ ہر اہل قلم کو زیادہ احتیاط، زیادہ محنت، اور زیادہ علمی دیانت داری کی ضرورت کا احساس دلایا ہے، انکا اردو میں تحقیقی رسالہ "معیار" اہم رسالوں میں تھا اس سے بہتوں کو تحقیق کا سلیقہ آیا۔

قاضی صاحب نثر میں انداز بیان کی وضاحت، منطقی ربط اور سادگی کے قائل تھے، انکے نزدیک نثر کا حسن سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے، جس قدر صاف اور مدلل طریقے پر نثر اپنے مضمون کو ادا کر سکے گی اسی قدر وہ معیاری کہلانے کی مستحق ہوگی۔

قاضی صاحب نے آزادی سے قبل سیاسی تحریکوں میں عملاً حصہ لیا تھا، اور اپنی تعلیمی زندگی کو حب وطن کی خاطر خیرباد کہہ دیا تھا، اس لئے ہندوستان کے مقتدر سیاسی لیڈر انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے، قاضی صاحب نے اپنی خود نوشت کہانی میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اردو زبان کے سلسلے میں گاندھی جی، راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے درمیان جو تاریخی بات چیت ہوئی اور معاہدہ طے پایا تھا وہ قاضی صاحب کی قیام گاہ پٹنہ میں ہی ہوا تھا، گو اس معاہدے پر عمل نہ ہو سکا لیکن اردو کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

قاضی صاحب طبعاً حلیم، شریف النفس، وضعدار اور خلیق انسان تھے، مذہبی لحاظ سے انکے عقائد کے بارے میں لوگ مشکوک رہے، لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کا اظہار نہیں کیا، ان کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ زبان و ادب کی خدمت میں بسر کیا، ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی بنا پر حکومت ہند نے پدم شری اور صدر جمہوریہ کے سرٹیفکیٹ سے نوازا، غالب انسٹی ٹیوٹ دلی نے غالب ایوارڈ دیا، اور اردو اکیڈمیوں نے انکی ادبی خدمات کا اعتراف کیا، لیکن قاضی صاحب ان سب باتوں سے کہیں بلند تھے وہ اردو ادب کی تاریخ میں لازوال نقوش چھوڑ گئے ہیں، جو کبھی مٹائے نہیں جا سکتے۔

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول و دوم مرتبہ، مولانا طاہر حسن صاحب امروہوی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی مجموعی صفحات ۵۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ، ضلع مراد آباد۔

یہ کتاب جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی پہلی پیشکش ہے اس کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری ہے، لیکن در اصل اس میں مختلف پہلوؤں سے آپ کا نبی و رسول ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس ضمن میں آپؐ کے بعض حالات و واقعات زندگی بھی زیر بحث آگئے ہیں، مصنف نے پہلے رسولوں کی ضرورت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ انسان کو امور خیر و فلاح سے مطلع کرنے کے لئے مبعوث کئے جاتے ہیں پھر ان کی علامات، اہم خصوصیات اور خدا کی جانب سے کئے گئے اس اہتمام کا ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ ان کے پیغمبر ہونے کا یقین کر لیتے ہیں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتابوں نیز ہندو مذہب کے رشیوں منیوں اور دوسرے مذہبوں کے بزرگوں کی پیشین گوئیاں نقل کی گئی ہیں اور آپؐ کی ولادت سے قبل و بعد کے متعدد واقعات تحریر کئے ہیں جن سے بھی آپ کا نبی ہونا ظاہر ہوتا ہے، مصنف نے اسلام کے غیر معمولی اثر و نفوذ اور مختلف ملکوں اور قوموں میں اس کی حیرت انگیز اشاعت کی داستان بیان کر کے بھی آپ کی نبوت ثابت کی ہے، اسی طرح آنحضرتؐ کی عظمت، مقبولیت اور محبوبیت دکھانے کے لئے اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن کے تراجم پر غیر مسلم مصنفین کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اور یورپین مورخین اور دوسرے فضلا کی آپؐ کے بارہ میں رائیں نقل کی ہیں، اس سے اور مختلف صحابہ کرامؓ اور اشخاص کے

قبول اسلام کے واقعات قلمبند کر کے بھی انھوں نے اپنے مقصود و مدعا کو ثابت کیا ہے، آخر میں قرآن کریم کے اعجاز کے متعدد دلائل پیش کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر برنا باکی انجیل سے قرآن کی حقانیت و صداقت کا ثبوت فراہم کیا ہے، اور اقتصادیات، مساوات، الٰہیات، رسالت، عبادت طہارت، معاملات، اخلاق، تعزیرات، فلکیات اور آخرت کے متعلق قرآنی نظریہ کی وضاحت کے علاوہ اس کا عالمگیر، آفاقی اور مکمل ضابطہ حیات ہونا ثابت کیا ہے اور صلح و جنگ، مذہبی آزادی اور عقل و فکر کی اہمیت کے بارے میں اس کی تعلیم و ہدایت بیان کی گئی ہے، اور توثیق و تائید کے لیے مغربی و مشرقی مفکرین کے خیالات بھی نقل کئے گئے ہیں، اس ضمن میں غلاموں اور عورتوں کے حقوق پر بھی گفتگو ہے، الٰہیات کی بحث میں نصاریٰ کے نظریہ تثلیث و عقیدۂ الوہیت مسیح کا ابطال بھی کیا ہے، آخر میں آپؐ کی ولادت سے مدینہ کی روانگی تک کے بعض واقعات بیان کئے ہیں جن کا مقصد بھی آپؐ کی نبوت کا اثبات ہے، مثلاً حضرت آمنہ کا خواب، محمد اور احمد آپؐ کا نام تجویز کیا جانا، حضرت حلیمہ کے یہاں شق صدر کا واقعہ، بکریاں چرانے کی حکمت، بحیرا راہب، تجارت اور دوسرے معاملات میں آپؐ کی امانت، دیانت و راستبازی اور اس کا عام اعتراف، آغاز وحی کے وقت ورقہ بن نوفل کے یہاں جانا، اعلانِ دعوت کے بعد آپؐ پر اور صحابہ کرامؓ پر مشرکین کے مظالم اور مدینہ میں اشاعتِ اسلام وغیرہ، گو مصنف نے اس کتاب میں گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کیلئے دلائل و شواہد کا انبار لگا دیا ہے، مگر ترتیب میں ناہمواری اور تحریر کو نہ سمیٹنے کی وجہ سے تکرار، طوالت، بے ربطی، انتشار اور خلط مبحث پیدا ہو گیا ہے، ولادت اور تاریخ ولادت کا ذکر دونوں حصے میں ہے، دوسرے حصہ کی ابتدا میں بسم اللہ کی بحث بے محل ہے اس کی جو توجیہ کی گئی ہے، اور رحمٰن و رحیم کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے، وہ بھی محل نظر ہے، غیر معتبر اور بے اصل واقعات و روایات بھی محض شہرت کی وجہ سے نقل کر دیے ہیں، حوالے ثانوی لوضمنی

ماخذ کے دے گئے ہیں اور عموماً جلدوں اور صفحات کی صراحت نہیں کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ یہاں حضرت محمدؐ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، اور ابراہیمؑ نیز رام چندرجی، شری کرشن، مہاتما بدھ اور زرتشت وغیرہ کے حالات پیش کئے جارہے ہیں (ص ۹) مگر دونوں حصوں میں کہیں ان کے حالات درج نہیں ہیں، البتہ آنحضرتؐ کے بارہ میں ان لوگوں کی پیشین گوئی نقل کی گئی ہے، دوسرے حصہ کے خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی اس کتاب کے اور حصے زیر ترتیب ہیں ممکن ہے، ان میں حالات درج کئے جائیں مگر اس کی کوئی صراحت نہیں کی ہے، ایک جگہ لکھا ہے، اس لئے قوی امکان ہے کہ رامچندرجی شری کرشن اور مہاتما بدھ جیسے افراد خدا کے نبی یا رسول ہوں" (ص ۹)، اور اس کی تائید میں مرزا مظہر جانجاناں اور علامہ ابن حزم کے اقوال نقل کئے ہیں، دوسرے حصہ کے دیباچہ میں اس کی تردید کی ہے کہ یہ میری رائے نہیں ہے، مرزا صاحب وغیرہ کی رائے ہے، حالانکہ یہ تردید ناکافی ہے مصنف کو اپنی سوء تعبیر و نقل بیان کا اعتراف کرنا چاہئے جب ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتاب جدید مذاق اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ اور غیر مسلم منصف مزاج لوگوں کے اطمینان کے لئے لکھی ہے تو مبشرات اور خوابوں کو نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ وہ فی نفسہ حجت اور دلیل بھی نہیں، مصنف نے بسم اللہ کو قرآن کا آغاز بتایا ہے جس کا لازمی مطلب یہ نکلا کہ وہ سورہ فاتحہ کا جزء ہے، یہی شوافع کی بھی رائے ہے، مگر مصنف کا تعلق جس فقہی مذہب سے ہے، اس میں بسم اللہ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، کتاب میں زبان و بیان اور کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی ہیں مثلاً "لہذا" اپنے اس کمال سے دنیا کے افراد بلکہ قوموں میں نیکی اور سچائی کی روح

پھونک دیتا اور ہدایت کا انقلاب پیدا کر دیتا ہے (ص ۱۳)" اسی طرح اسلام کی روشن تعلیمات کی نوعیں (ص ۶۲) یا قرآن و شواہد کی نوعیں (ص ۱۷) ہدایت کا انقلاب اور تعلیمات یا شواہد کی نوعیں بے معنی ہیں اور وہ کن سے کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناراض ہوتا ہے (ص ۱۰) جہالت و توہم پرستی کی اندھیریاں معنی شروع ہوگئیں (ص ۶۵) کون کے بجائے کن اور اندھیریاں کی جگہ اندھیرے لکھنا مناسب ہے، درستی کامیابی (ص ۸) کی ترکیب بھی درست نہیں، آنحضرتؐ کیلئے تازہ ترین پیغمبر (ص ۱۰۱) اور ابو طالب کیلئے خوابیدہ (ص ۱۵۵) کا استعمال پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا۔

"ض"

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں رواخاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس تک ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، ان کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کردی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب آتشیں اسلحے، بحری بیڑے فوج کا کوچ، صف آرائی ترتیب، میدان جنگ قلعے، چھاؤنیاں کمین گاہیں مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

"منیجر"